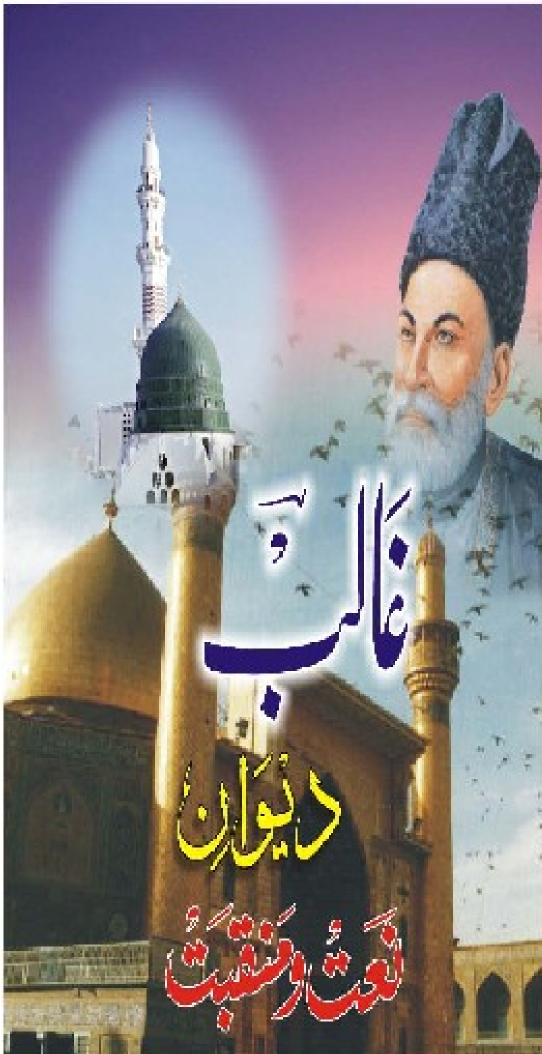


ڈاکٹر سید تقی عابدی

غالب

دیوان

نعت و منقبت

ڈاکٹر سید تقی عابدی

Ghalib

Dewane

Naat-o-Manqabat

By

Dr. Syed Taghi Abedi

SHAHID PUBLICATIONS

2253, DARYA GANJ, NEW DELHI-110002

غالبؔ

دیوانِ

نعت و منقبت

تحقیق ، تدوین ، تنقید وتشریح

ڈاکٹر سید تقیؔ عابدی

کتاب : غالبؔ دیوانِ نعت ومنقبت

تحقیق وتدوین اور تنقید : ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

سنہ اشاعت : 2006ء

تعداد : 1000

کتابت : سید فیروز۔Urdu World Net

مارکھم۔اونٹاریو۔کینیڈا

ٹیلیفون(905) 470-2040

ایڈیشن : اوّل

ملنے کے پتے

DR.SYED TAGHI ABEDI

1110, Secretariate Rd., Newmarket

ON, L3X 1M4 Canada

Tel:905-868-9578 (Res)

Tel:416-495-2701 Ext.5233 (Work)

Fax: 905-868-9578

e-mail:taqiabedi@Rogers.com

SHAHID PUBLICATION

2253, Resham Street, Kucha Chelan, Darya Ganj

New Delhi-110002

Tel:011-23272724

e-mail:drshahidhusain_786@yahoo.com

انتساب

غواصِ بحرِ معنوی ، زینت دھندۂ محفلِ لکھنو

شاھباز بلند پرواز آسمان تنقید، عندلیب گلستانِ ادب و ادیبؔ

مصوّرِ "تعبیر غالبؔ"

پروفیسر سید نیّر مسعود رضوی

کے نام

بقول غالبؔ

ع۔ زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہیئے

فہرست

رَو میں ہے رخشِ عمر

نام	:	سید تقی حسن عابدی
ادبی نام	:	تقی عابدی
تخلّص	:	تقیؔ
والد کا نام	:	سید سبط نبی عابدی منصف (مرحوم)
والدہ کا نام	:	سنجیدہ بیگم (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	:	یکم مارچ 1952ء
مقام پیدائش	:	دہلی (انڈیا)
تعلیم	:	ایم بی بی ایس (حیدرآباد، انڈیا)
		ایم ایس (برطانیہ)
		ایف سی اے پی (یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ)
		ایف آر سی پی (کینیڈا)
پیشہ	:	طبابت
ذوق	:	شاعری، ادبی تحقیق و تنقید
شوق	:	مطالعہ اور تصنیف
قیام	:	ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک، کینیڈا
شریکِ حیات	:	گیتی
اولاد	:	دو بیٹیاں (معصوما اور رویا) دو بیٹے (رضا و مرتضیٰ)

تصانیف : (۳۰) شہید (1982ء)، جوشِ مودّت، گلشنِ رویا، اقبالؔ کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاؔء، رموزِ شاعری، اظہارِ حق، مجتہد نظم مرزا دبیرؔ، طالع مہر، سلکِ سلام دبیرؔ، تجزیہ یادگار انیسؔ، ابواب المصائب، ذکر دُرباران، عروسِ سخن، مصحفِ فارسی دبیر، مثنویات دبیرؔ، کائناتِ نجمؔ، روپؔ کنوار کماری، دُربار رسالتؐ، فکر مطمئنہ، خوشۂ انجم، دُرِدریائے نجف، تاثیر ماتم، نجمی مایا، روشِ انقلاب، مصحفِ تغزل، ھوالنجم، تعشق لکھنوی، ادبی معجزہ

زیرِ تالیف : تجزیۂ شکوہ جواب شکوہ، رباعیات دبیرؔ، فانؔی لا فانی، تجزیہ رباعیات فراقؔ گورکھپوری

حرفِ چند

سچ تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ غالبؔ کی نعت ومنقبت کے بارے میں اجمالی گفتگو کرنا حقیقت میں بحرِ بیکراں کو کوزے میں بند کرنے سے کم نہیں۔ پھر بھی اس سنگِ گراں کو میں نے تک وتنہا بلند کر کے محراب عشق پر جما دیا ہے۔ میری زبان اور میرے بیان پر فارسی کی گہری چھاپ ہے جو شاید میرے فارسی مطالعہ اور ذاتی ماحول کی وجہ ہو، امید ہے کہ قارئین درگزر کریں گے۔ راقم نے بعض مقامات پر خود فارسی اشعار کا ترجمہ کیا اور بعض مقامات پر اگر عمدہ فارسی ترجمہ حاصل ہوا تو شکریہ کے ساتھ اس بیاضِ عشق میں شامل کیا تاکہ میرا مقصد اوران علمائے ادب کے کام کی قدر دانی ہو سکے۔ اس کتاب میں مرحوم ڈاکٹر ظ۔ انصاری، مرحوم عبدالباری آسیؔ کے ترجموں کے ساتھ ساتھ آنجہانی کالی داس گپتا رضاؔ کے مقدمہ کے اقتباس کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

اگرچہ یہ دیوان نعت ومنقبت اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے جس میں اس موضوع پر غالبؔ کی تمام شعری اور نثری تخلیقات کو شامل کیا گیا ہے لیکن پھر بھی اربابِ علم وفن سے گزارش ہے اگر غالبؔ کا اس موضوع پر کلام شامل ہونے سے رہ گیا ہو تو اطلاع دینے سے دریغ نہ فرمائیں۔

نشوونما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

خیراندیش

سید تقی عابدی

ٹورانٹو۔ کینیڈا

۲۸ر نومبر ۲۰۰۶ء

سعدیؔ اگر عاشقی کنی و جوانی
عشق محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ

(سعدیؔ شیرازی)

(غالبؔ کا عقیدہ بھی یہی ہے)

غالبؔ کا زندگی نامہ

نام : مرزا اسد اللہ بیگ

عرف : مرزا نوشہ

خطابات : نجم الدولہ دبیر الملک۔ نظام جنگ

تخلص : اسدؔ۔ غالبؔ

(جناب اکبر علی خان عرشی زادہ نے دیوان غالبؔ نسخۂ عرشی زادہ میں استدلال کیا ہے کہ مرزا غالبؔ نے 1816 مطابق 1231 ھجری میں اسدؔ تخلص ترک کر کے غالبؔ تخلص اختیار کیا)

تاریخ ولادت : 8 رجب 1212 ھجری مطابق 27 ڈسمبر 1897 عیسوی۔ طلوع صبح روز یکشنبہ

مقام ولادت : آگرہ (اکبر آباد)

والد : مرزا عبد اللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا

والدہ : عزت النساء بیگم دختر خواجہ غلام حسین خاں (جن کا شمار شہر کے عمایدین اور امراء میں ہوتا تھا)

جد : غالبؔ کے دادا قوقان بیگ ماوراء النہر سے شاہ عالم کے دور میں ہندوستان آئے

قومیت : ترک سلجوقی

بھائی : غالبؔ کے ایک دو سال چھوٹے بھائی مرزا یوسف خاں تھے جو ایام جوانی میں مجنون ہو کر 1857 عیسوی میں انتقال کر گئے

شریک حیات : امراؤ بیگم دختر نواب الٰہی بخش

غالبؔ کی عمر شادی کے وقت 13 برس اور امراؤ بیگم کی عمر گیارہ سال تھی۔

غالبؔ لکھتے ہیں۔ ”7/ رجب 1225 ھجری کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پانوں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔“ امراؤ بیگم نے غالبؔ کے انتقال کے ایک سال

بعد 1870ء میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔

اولاد : سات اولادیں پیدا ہوئیں لیکن کسی کی عمر (15) مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔
غالبؔ سیف الحق کو اس کے لڑکے کے مرنے پر لکھتے ہیں۔ ''تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا، بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ چوہتّر (74) برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔''

سکونت : غالبؔ نے زندگی کے پہلے 13 برس آگرہ میں گزارے اگر چہ دہلی میں آتے جاتے رہے لیکن ان کی عمر 14 برس کی تھی جبکہ انھوں نے دلّی میں مستقل سکونت اختیار کی اور کئی مکانات تبدیل کیے۔ دلّی میں غالبؔ کا قیام قریب ساٹھ برس تھا۔ غالباً کبھی کوئی مکان نہیں خریدا ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کرائے کے بھی رہے۔ بقول حالیؔ قاسم جان کی گلی یا حبش خاں کے پھاٹک یا اس کے قرب و جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے سب سے اخیر مکان جس میں ان کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں مرحوم کے دیوان خانہ کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں۔

مسجد کے زیر سایہ ایک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

غالبؔ خط میں لکھتے ہیں۔ ''میں اب بلیماران میں ایک حویلی کرایہ پر لے کر اس میں رہتا ہوں۔ دس گیارہ برس سے اس تکنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپیہ دیے گیا تین برس کا کرایہ چھ اوپر سو روپیہ ایکمشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے پیام بلکہ ابرام کیا مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو میں اٹھوں۔ بیدرد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی صحن بالا خانے کا جس کا دو گز عرض اور دس گز طول اس میں پاڑھ بندھ گئی رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت پاڑ کا قرب گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹ گھر ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں

اس طرح گزریں دوشنبہ 29 جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آ گیا وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی۔ یہ مکان نسبت اُس مکان کے بہتر ہے

شکل وصورت : لانبا قد، چوڑا چکلا ہاڑ، سڈول اکہرا جسم، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، کتابی چہرہ، کھڑا نقشہ، چوڑی پیشانی، ناک کی کاٹھی اونچی، رخسار کی ہڈیاں ابھری ہوئی، بادامی آنکھیں گھنی لمبی پلکیں، کان لمبے اور سرخ وسپید رنگ۔

غالبؔ عنفوان شباب میں دلّی کے حسین اور خوش رو لوگوں میں شمار کئے جاتے۔

حالیؔ نے غالبؔ کو بڑھاپے میں دیکھا تب بھی خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے اور قد وقامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔

غالبؔ حاتمؔ علی مہر کو حلیہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کے جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے وہ مزے یاد آگئے کیا کہوں جی پر کیا گزری جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملاّ، حافظ بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی سر پر لمبے بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اُسی دن سر منڈوایا۔

جوانی میں مسّی کا استعمال بھی کرتے تھے۔ آخری عمر میں لمبا قد ہونے کی وجہ سے کمر میں ذرا خم آگیا تھا۔

مسافرت : غالبؔ نے اپنی زندگی میں بہت کم سفر کئے۔

ا۔ آگرہ اور دہلی کے درمیان کئی بار آئے گئے۔

ب۔ ایک دفعہ میرٹھ گئے۔

ج۔ دوبار رام پور کا سفر کیا۔

د۔ایک بار فیروز پور اور بھرت پور بھی گئے۔

ھ۔غالبؔ کا سب سے طولانی اور مشہور سفر کلکتہ کا تھا جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ا۔ماہ شوال **1242** ھجری مطابق اپریل **1827** عیسوی کو دہلی سے روانہ ہوئے۔

۲۔دہلی سے لکھنو گئے جہاں ان کا قیام تقریباً پانچ مہینے رہا۔اس دوران ایک مرتبہ کانپور بھی گئے لیکن لکھنو کے دوستوں نے دوبارہ لکھنو بلوالیا۔جس وقت غالبؔ لکھنوَ گئے اُس زمانے میں غازی الدین حیدر شاہ اودھ میں تھے اور نائب صدر نواب آغا میر صاحب تھے۔بقول غلام رسول مہر مرزا غالبؔ اس لئے دلّی سے لکھنو گئے کہ ’’انھیں امید تھی کہ بادشاہ اودھ سے اچھی رقم مل جائے گی‘‘۔بقول غالبؔ

لکھنوآنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی　　　ہوس سیر وتماشا سووہ کم ہے ہم کو

مقطع شوق نہیں ہے یہ شہر　　　عزم سیر نجف وطوف حرم ہے ہم کو

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ

جادۂ رہ کشش کام کرم ہے ہم کو

ع ۔لائی یاں معتمد الدولہ بہادر کی امید

لیکن لکھنو میں غالبؔ کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔دربار تک رسائی ، مالی اعانت اور شاہی اعزاز سے غالبؔ محروم رہے جس کی وجہ غالبیات کے ماہرین نے غالبؔ کی خودداری اور شرطیں بتائی ہیں کیوں کہ غالبؔ نے جو مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں نائب السلطنت روشن الدولہ کے سامنے پیش کرنے لکھی تھی اور جو کبھی پیش نہیں کی جاسکی اُس کی پہلی دو شرطیں یہ تھیں کہ

ا۔نائب صدر اپنی جگہ پر کھڑے ہوکر غالبؔ کی پذیرائی کریں۔

ب۔نذر پیش کرنے سے غالبؔ کو معاف رکھا جائے۔

چنانچہ اسی لئے غالبؔ نے لکھنو کو ستم آباد کہا ہے۔بقول غالبؔ

’’بتاریخ **26** ذی قعدروز جمعہ ازآں ستم آباد برآمدم وبتاریخ **29** دردارالسرور کانپور رسیدم‘‘۔غالبؔ کو اگرچہ مالی لحاظ سے لکھنو میں کچھ فائدہ نہ ہوا لیکن لکھنو کے قیام

کے دوران یہاں کے عمایدین اور برگزیدہ شخصیتوں سے غالبؔ کی ملاقات اور تعلقات قائم ہو گئے۔ جن میں شیخ ناسخؔ، مجتہد العصر سید محمد، میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، امیر اللہ سرور، عاشق علی خاں اور صاحبزادے منشی امیر حسن بسمل قابلِ ذکر ہیں۔ فروغ اُردو کے غالبؔ نمبر نومبر 1968 میں لکھا ہے کہ "غالبؔ کی انیسؔ سے ملاقات ہوئی اور غالبؔ نے اُن سے کسی غزل کی فرمائش کی تو انھوں نے غزل کی بجائے ایک سلام سنایا اور کہا کہ آپ جواباً اپنا کوئی مرثیہ سنائیں۔ غالبؔ نے اپنے کہے ہوئے مرثیہ ۔ع۔ ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو

کے تین بند انیسؔ کو سُنا کر یہ بھی کہہ دیا کہ "مرثیہ کہنا تو آپ ہی کا حق ہے۔"

میر انیسؔ نے مرزا غالبؔ کے انتقال پر یوں منظوم خراج ادا کیا

گلزار جہاں سے باغ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوارِ رحمت میں گئے
مدّاحِ علیؑ کا مرتبہ اعلیٰ ہے
غالبؔ اسد اللہ کی خدمت میں گئے

تذکرۂ جلوہ خضر جلد اوّل میں ایک روایت کے بموجب مرزا غالبؔ لکھنو میں مرزا دبیرؔ سے بھی ملے تھے۔ غالبؔ نے دبیرؔ کی فرمائش پر اپنا کہا ہوا ایک مرثیہ سنایا تو ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ

"ع۔ یہ مرثیہ ہے کا ہے کو واسوخت ہو گیا

حضرت! یہ حق تو آپ کا ہی ہے دوسرا اس کوچہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

۳۔ 26 ذی قعد مطابق 27 جون 1827ء کو لکھنو سے کان پور روانہ ہوئے اور تین دن سفر میں طے کر کے کان پور پہنچے اور کچھ دن قیام کیا۔

۴۔ غالبؔ کان پور سے باندہ گئے جہاں ان کا ماموں زاد بھائی رہتا تھا۔ غالبؔ کا باندہ میں تقریباً چھ مہینے قیام رہا۔ باندہ کے قیام کے دوران کچھ غزلیات کہی اور دوستوں کو ارسال کی۔

۵۔غالبؔ باندہ سے موڈہ اور وہاں دو روز ٹھہر کر چلہ تارا گئے اور پھر الہٰ آباد میں 24 گھنٹے گزار کر بنارس پہنچے۔

۶۔غالبؔ جولائی **1827**ء میں بنارس آئے اور تقریباً چھ مہینے بنارس میں رہ کر 29 ڈسمبر **1827**ء کو بنارس سے پٹنہ اور مرشد آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔

غالبؔ بنارس میں خوش رہے اور انھوں نے یہاں ایک (108) اشعار پر مشتمل خوب صورت مثنوی جو نہایت مرصع اور مسجع فارسی مثنوی ''چراغ دیر'' کے نام سے حسینانِ بنارس کے حسن و جمال کی تعریف میں لکھی۔

۷۔ بنارس سے پٹنہ اور مرشد آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے اور وہاں دو سال گزارے اور 29 نومبر **1829**ء کو دہلی واپس ہوئے۔ کلکتہ کے سفر کا مقصد اور قیام کے دوران کے مسائل کا خلاصہ یہ تھا۔

ا۔غالبؔ نے اپنی پنشن کا مقدمہ سپریم کورٹ میں دائر کیا جس میں اگر چہ انگریز حکمرانوں نے غالبؔ کے حق کی تائید کی تھی لیکن مقدمہ کا غالبؔ کے خلاف فیصلہ ہوا۔ مقدمہ سولہ سال تک چلتا رہا۔ غالبؔ ہزاروں روپیوں کے مقروض ہو گئے۔ غالبؔ کو دوسرے ورثا کے ساتھ تین ہزار روپے سالانہ سے زیادہ نہ ملے۔ سرکار کی جانب سے خطاب بھی نہ ملا۔

ب۔غالبؔ دو سال تک ایک کھلا پر فضا مکان دس روپے کرایہ پر لے کر آرام سے رہے۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں کے علاوہ علمی مجادلوں میں شریک رہے۔

ج۔کلکتہ کے دوران غالبؔ کے کلام پر اعتراضات، غالبؔ کا جواب اور پھر جواب کا ردِ عمل اور غالبؔ کی مصالحت کی کوششیں اور معروف مثنوی ''آشتی نامہ'' کی تصنیف کی داستان طولانی ہے۔ اس طولانی مثنوی جو (158) اشعار پر مشتمل ہے اس کا بعد میں نام بدل کر ''بادِ مخالف'' رکھا گیا۔

بقول حالیؔ مرزا کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی جب کہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے اسٹرلنگ صاحب سکریٹری گورنمنٹ ہند نے جن کی مدح میں مرزا کا فارسی

قصیدہ ان کے کلیات میں موجود ہے، وعدہ کیا تھا کہ تمہارا حق ضرور تم کو ملے گا۔ کول برک صاحب جو اُس وقت دلّی میں رزیڈنٹ تھے انھوں نے دلّی ہی میں مرزا سے عمدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کرلیا تھا۔ مگر آخر کار نتیجۂ ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا۔ گورنمنٹ نے سرجان میلکم گورنر بمبئی سے جو لارڈ لیک کے سکرٹری رہ چکے تھے مرزا کے مطالعہ کی بابت استفسار کیا۔ انھوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا۔ جب مرزا کو مایوسی ہوئی تو انھوں نے ولایت میں اپیل کی مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔

تعلیم و تربیت : ا۔ غالبؔ کی والدہ پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ غالبؔ نے ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔

ب۔ آگرہ میں مولوی معظم سے کسب علم کیا۔

ج۔ عبدالصمد ایک پارسی نژاد شخص سے جس کا مسلمان ہونے سے پہلے نام ''ہرمزد'' تھا فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ عبدالصمد عزلی کا بھی استاد تھا۔

غالبؔ نواب کلب علی خاں کو لکھتے ہیں۔ ''بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا چاہتا تھا فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اُس سے حقائق و دقائق زبان فارسی کے معلوم کئے۔ عبدالصمد غالبؔ کے حُسن قابلیت اور استعداد سے متاثر تھا۔ چنانچہ وہ ہندوستان سے باہر چلے جانے کے بعد بھی غالبؔ کو یاد کرتا رہتا تھا۔ حالیؔ یادگار غالبؔ میں لکھتے ہیں ''قاطع برہان'' اور ''درفش کاویانی'' کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالصمد نے تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور گُر اور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار اور دیگر ضروری باتیں مرزا کے دل میں تہ نشین کردی تھیں۔

ملازمت : ا۔ غالبؔ نے زندگی بھر انگریز سرکار کی ملازمت نہ کی۔ مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہند نے گورنمنٹ دہلی کالج کے فارسی مدرّس کی جگہ جس کی تنخواہ سو روپیہ ماہوار تھی غالبؔ کو بلوایا لیکن حسب سابق ان کے استقبال کو پالکی تک نہ پہنچا تو غالبؔ نے اس

نوکری سے انکار کر دیا۔

حکایت : مسٹر ٹامسن کے بلوانے پر جب غالبؔ پالکی سے اُتر کر اِس انتظار میں ٹھہرے کہ سکرٹری صاحب ان کے استقبال کے لئے آئیں گے اور جب معلوم ہوا کہ سکرٹری صاحب اِس لئے نہیں آئیں گے کہ غالبؔ نوکری کرنے کے لئے آ رہے ہیں تو غالبؔ نے کہا کہ ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز میں کمی ہوئے۔ صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔ مرزا غالبؔ نے کہا مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور یہ کہہ کر چلے آئے۔

ب۔ بہادر شاہ ظفر نے 1266 ھجری میں غالبؔ کو خلعت جواہر اور پچاس روپیہ ماہوار کے وظیفہ پر مامور کیا تاکہ خاندان تیمور کی تاریخ نویسی کتابی شکل میں مرتب کی جا سکے۔ جب 1271 ھجری میں استاد ذوقؔ کا انتقال ہو گیا تو بہادر شاہ ظفر کے اشعار کی اصلاح اور دربار کے ملک الشعرا کی جگہ بھی غالبؔ سے متعلق ہو گئی۔ بقول غالبؔ ”جب بادشاہ دہلی نے مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی۔ مقطع اس کا یہ ہے۔

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ اُن کے ولی عہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔“

ج۔ 1855ء میں والی رام پور نواب یوسف علی خان غالبؔ کے شاگرد ہوئے۔ یہ سلسلہ نواب کی موت 1865ء تک جاری رہا۔ پھر 1865ء سے 1869ء تک نواب کلب علی خان سے خط و کتابت رہی۔ غالبؔ لکھتے ہیں۔ ”نواب یوسف علی خان بہادر والی رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں۔ اس سال یعنی 1855 میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے ہیں۔

اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہا۔ غالبؔ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں دربار رام پور سے سو روپیہ کی ہنڈوی ملتی اور وہ ہر بار والی رام پور کو دعا دیتے۔ ع۔ تم سلامت رہو ہزار برس

1865ء میں نواب کلب علی خان نے غالبؔ کو جشن مسند نشینی کی شرکت پر ایک ہزار روپے دیئے اور رخصت ہوتے وقت مزید دو سو روپے بطور "زادِ راہ" دیئے۔ غالبؔ کے آخری دور میں دربار رام پور سے تعلقات خراب ہو گئے تھے جو پھر ٹھیک نہ ہو سکے۔ اور دربار سے غالبؔ کی مالی اعانت ختم کر دی گئی۔

پوشاک و لباس : گھر پر دہلی کے شرفا کا لباس ہوتا یعنی انگرکھا یا کُھلی آستین کا الفی گریبان کا کرتا اور برکا پاجامہ۔ ململ کی ہلکی ٹوپی جس پر کامدانی یا کشیدے کڑھائی کا کام ہوتا۔ جاڑوں میں گرم کپڑے کا کلی دار پاجامہ اور مرزئی پہنتے تھے۔ گھر پر بعض اوقات ریشمی لنگی بھی پہنتے تھے۔ باہر جاتے تو کُرتا، تنگ مہری کا پاجامہ، کرتے پر صدری۔ اوپر کسی بھاری اور قیمتی کپڑے کی قبا اور اوراس پر ایک جامہ۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں لمبا عصا جس کی شام پر کندہ تھا۔ یا اسد اللہ الغالب

می داشت عصای کندہ چو مہر بدست
بُد نقش بر آں "یا اسد اللہ الغالب"

سر پر عموماً کلاہ پاپاخ یا سیاہ پوستین کی چوگوشیہ لمبی ٹوپی۔ کبھی کبھی مغل انداز میں مخروطی کلاہ اور اُس پر دستار باندھ لیتے۔ جاڑوں میں شالی رومال بھی کندھوں پر ڈال لیتے تھے۔

خوارک و غذا : ا۔ صبح سویرے نہار منہ باداموں کا شیرہ مصری کے شربت کے ساتھ پیتے تھے۔
ب۔ ناشتہ کچھ دن چڑھے کرتے تھے۔
ج۔ دوپہر کا کھانا مفصّل ہوتا۔ گوشت کے شوقین تھے۔ بکری، دنبہ، مرغ، کبوتر، اور بٹیر شوق سے کھاتے۔ گوشت میں سبزی اور چنے کی دال ضرور ڈلواتے۔ روٹی سالن کے شوربے میں ڈبو کر کھاتے۔ پُرانے چاولوں کو ترجیح دیتے تا کہ زود ہضم

20 خطوط غالبؔ کا تحقیقی مطالعہ ... کاظم علی خان .... 1981ء .... لکھنو

21 خطوط غالبؔ .... مالک رام .... 1962ء .... لکھنو

22 عروسِ سخن .... تقی عابدی .... 2004ء .... لاہور

23 غالبؔ پر چند مقالے .... نذیر احمد .... 1991ء .... نئی دہلی

24 غالبؔ نما .... نیّر سلطان پوری .... 1969ء .... لکھنو

25 نظامی جنتری .... محمد سلطان مرزا .... 1949ء .... دہلی

26 ذکرِ دُرباران .... تقی عابدی .... 2006ء .... لاہور

27 ھما غالبؔ نمبر .... عبدالوحید صدیقی .... 1969ء .... نئی دہلی

28 اُردوئے معلّٰی غالبؔ نمبر ...... خواجہ احمد فاروقی .... 1969ء .... نئی دہلی

29 نقوش غالبؔ نمبر .... محمد طفیل .... 1969ء .... لاہور

30 نعت رنگ جلد (12)......... صبیح رحمانی .... 2001ء .... کراچی

31 آبِ حیات .... محمد حسین آزادؔ .... 1962ء .... الہ آباد

32 یادگارِ غالبؔ .... الطاف حسین حالؔی .... 1980ء .... الہ آباد

کو اصلاح کی نظر سے دیکھتے اور اس میں ضروری ردّ و بدل کرتے تھے۔

حافظہ و مطالعہ : غالبؔ کا حافظہ بلا کا تھا اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ کبھی گھر پر کتاب خرید کر نہیں رکھتے تھے بلکہ ہمیشہ کتاب داروں سے کرایہ پر کتاب منگوا کر پڑھتے اور واپس کر دیتے تھے اور کتاب کے تمام تر معنی و مطالب ان کے ذہن میں محفوظ ہو جاتے۔

تصانیف

اُردو

نظم

۱۔ دیوان اُردو

نثر

۱۔ عود ہندی
۲۔ اُردوئے معلّٰی
۳۔ مکاتیب غالبؔ
۴۔ نکات غالبؔ
۵۔ رقعات غالبؔ
۶۔ قادر نامہ
۷۔ نادرات غالبؔ
۸۔ انتخاب غالبؔ
۹۔ نامۂ غالبؔ
۱۰۔ تیغ تیز

فارسی

نثر

۱۔ پنج آہنگ
۲۔ مہر نیم روز
۳۔ دستنبو
۴۔ قاطع برہان
۵۔ درفش کاویانی

نظم

۱۔ دیوان فارسی
۲۔ سبد چین
۳۔ سبد باغ دودر
۴۔ دعائے صباح
۵۔ متفرقات غالبؔ
۶۔ مآثر غالبؔ

دیوان فارسی : غالب کی زندگی میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔

پہلا ایڈیشن	1845ء	506 صفحات	6672 اشعار	مطبع دارالسلام دہلی	یہ دیوان ضیاالدین احمد خان کی تصحیح و ترتیب کے بعد شائع ہوا۔ آخر میں غلط نامہ ہے اور نیّر رخشاں کے تاریخ کے دو قطع ہیں۔ یہ اب کمیاب ہے۔
دوسرا ایڈیشن	1863ء	-	10424 اشعار	منشی نولکشور	

غالبؔ کا فارسی دیوان 1835ء میں ''میخانہ آرزو'' کے عنوان پر مرتب ہو چکا تھا لیکن دس سال بعد شائع ہوا۔

سبد چین : اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے ایک 1867ء میں غالبؔ کی زندگی میں اور دوسرا 1938ء میں مکتبہ جامعہ دہلی کی طرف سے۔ اس میں مثنوی ''ابر گہر بار'' ہے جو (42) صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں (1098) اشعار ہیں۔

سبد باغ دودرو : یہ نسخہ دراصل سبد چین ہی کا بعد کا ایڈیشن ہے جو شائع نہ ہوسکا جس کو پروفیسر سید وزیرحسن عابدی صدر شعبہ فارسی و عربی دہلی یونیورسٹی نے شائع کیا اس کے پہلے حصّے میں مثنوی ابر گہر بار اور دوسرے حصّے میں چند نثریں شامل ہیں جو کلیات نثر میں موجود نہیں۔

دعائی صباح : یہ کتاب حضرت علیؑ کی دعا الصباح کا منظوم ترجمہ ہے جو غالبؔ نے اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ اسسٹنٹ کمشنر پولیس لکھنوی کی فرمائش پر لکھی اور یہ غالبؔ کی زندگی میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں (26) صفحات ہیں۔ کتاب میں

پہلے عربی دعا کی نثر ہے جس کے نیچے فارسی نثری ترجمہ ہے جو غالبؔ کا نہیں اور پھر غالبؔ کا (124) اشعار میں منظوم کردہ فارسی ترجمہ رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آخری دو صفحات میں امام زین العابدینؑ کی دعا کا سات شعر میں ترجمہ ہے۔ دعا صباح کا جدید ایڈیشن جسے مرحوم گیتا رضا نے ترتیب دے کر شائع کیا اس کتاب میں شامل ہے

متفرقاتِ غالبؔ : مرحوم مسعود حسن ادیب کی ترتیب کردہ کتاب 1947ء میں ہندوستان پریس رام پور سے شائع ہوئی جس میں فارسی خطوط، کچھ نظمیں اور اُردو غزل شامل ہے جسے غالبؔ نے ایک قلمی بیاض میں کلکتہ کے قیام کے دوران لکھے تھے۔ اس میں مثنوی باد مخالف کے علاوہ مثنوی ظفر بھی شامل ہے جو غالبؔ نے دہلی میں تصنیف کی تھی۔ اس کتاب میں ادیبؔ مرحوم کا بسیط مقدمہ بھی شامل ہے۔

مآثرِ غالبؔ : اس کتاب میں غالبؔ کے (32) بتّیس فارسی خطوط ہیں جو غالبؔ نے کلکتہ اور ڈھاکہ کے دوستوں کے نام لکھے تھے جنھیں قاضی عبدالودود نے حکیم حبیب الرحمن کے کتاب خانہ سے حاصل کر کے مفید حاشیوں اور بعض نادر اُردو فارسی تحریروں کے ساتھ شائع کیا۔ مآثرِ غالبؔ 1949ء میں علی گڑھ میگزین کے غالبؔ نمبر میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔

پنج آہنگ : اگرچہ غالبؔ نے اس کتاب کو 1825ء میں تصنیف کیا وہ پہلی بار 1849ء میں مطبع سلطانی اور دوسری بار 1853ء میں مطبع دارالسلام دہلی سے شائع ہوئی۔ بقول غالبؔ اس مجموعہ کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا۔ یہ کتاب (493) صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے پانچ حصے ہیں جن میں القاب و آداب اور اُن سے متعلقہ مراتب، مصطلحات و لغات فارسی، مکاتب منتخب اشعار اور تقاریظ وغیرہ شامل ہیں۔

مہرِ نیم روز : شاہ ظفر کی خواہش پر غالبؔ تاریخ دنیا کے آغاز سے مغل حکمران عہد تک کے حالات جس کتاب میں لکھنا چاہتے تھے اُس کا نام پرتوستان تھا جس کا پہلا حصہ ''مہر نیم روز'' اور دوسرا حصہ ''ماہ نیم ماہ'' تجویز کیا تھا۔ مہر نیم روز (116) صفحات کی کتاب

1854 میں فخر المطابع سے شائع ہوئی لیکن دوسرے حصہ کے لکھنے کی نوبت نہیں آئی اور 1857ء کے ہنگامہ میں خاندان تیمور کا خاتمہ ہوگیا۔

دستنبو : اس کتاب میں غالبؔ نے غدر کے حالات لکھے اور یہ التزام بھی کیا کہ تمام کتاب میں کوئی عربی لفظ نہ آنے پائے۔ غالبؔ نے غدر کے حالات اگست 1858ء تک لکھ کر کتاب ختم کردی۔ اس (88) صفحات کی کتاب کو مطبع مفید خلایق نے 1858ء میں شائع کیا۔

قاطع برہان : غالبؔ نے برہان قاطع فارسی کی لغت جسے محمد حسین تبریزی ثم دکنی نے لکھا تھا اس کی غلطیوں کو نکال کر قاطع برہان کے نام سے 1862ء میں نول کشور سے شائع کروایا اس کتاب میں (97) صفحات ہیں۔

درفش کاویانی : قاطع برہان میں مزید اضافات اور مطالب جمع کرکے 1865ء میں غالبؔ نے اکمل المطابع سے شائع کیا۔ اس کتاب میں (154) صفحات ہیں۔

دیوان اُردو غالبؔ : یہ منتخب دیوان مرزا غالبؔ کی زندگی میں پانچ مرتبہ شائع ہوا اور آج بھی مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ غالبؔ نے اپنے دیوان کا انتخاب خود کیا۔ پہلی بار مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر ''گل رعنا'' کے نام سے اور دوسرا 1866ء میں نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر جسے ''انتخاب غالبؔ'' کے نام سے امتیاز علی عرشی نے کتاب خانہ رامپور سے شائع کیا۔ غالبؔ نے جس دیوان سے یہ انتخاب کیا وہ بھی ''نسخہ حمیدیہ'' کے نام سے بھوپال سے شائع ہوچکا ہے۔ غالبؔ کی زندگی میں جو منتخب دیوان پانچ بار شائع ہوئے ان کی تفصیل یوں ہے :

ایڈیشن	سنہ طبع	تعداد شعر	مطبع	ملاحظات
پہلا	1841ء	1070	مطبع سید الاخبار۔ دہلی	صفحات 108۔ شروع میں غالبؔ کا فارسی دیباچہ اور آخر میں ضیا الدین احمد کی تقریظ ہے۔ اس کا ایک نسخہ رامپور لائبریری میں ہے۔

ایڈیشن	سنہ طبع	تعداد شعر	مطبع	ملاحظات
دوسرا	1847ء	1159	مطبع دارالسلام۔ دہلی	غالبؔ کا فارسی دیباچہ اور نثر رخشاں کی تقریظ ہے۔
تیسرا	1861ء	1796		صفحات 88 ۔ غالبؔ کا فارسی دیباچہ اور نثر رخشاں کی تقریظ ہے۔
چوتھا	1862ء	1796	مطبع نظامی۔ کانپور	صفحات 104۔ غالبؔ کا فارسی دیباچہ اور نثر رخشاں کی تقریظ ہے۔
پانچواں	1863ء	1795	مطبع منشی شیو نرائین۔ آگرہ	صفحات 146۔ غالبؔ کا فارسی دیباچہ اور نثر رخشان کی تقریظ ہے۔ اس کا ایک نسخہ 1994ء میں راقم نے نیویارک لائبریری میں دریافت کیا۔

ان پانچ ایڈیشنوں کے علاوہ کوئی اور ایڈیشن غالبؔ کی زندگی میں شائع نہ ہوا۔ غالبؔ نے اپنے فارسی دیباچہ میں جو اس کتاب میں موجود ہے تاکید کی تھی کہ اگر کہیں میرے اشعار دستیاب ہوں تو اس دیوان کا جزو نہ کئے جائیں لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ دیوان غالبؔ میں اشعار کی تعداد 2500 اشعار کے لگ بھگ ہے یعنی تقریباً سات سو اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ غالبؔ کی تاکید اور خواہش کا احترام کیوں نہیں ہوا؟

عود ہندی : مرزا غالبؔ کا مجموعہ ہے جس میں غالبؔ کے (137) خطوط کچھ تقریظیں اور نثری نمونے شامل ہیں۔ منشی ممتاز علی خان چودھری عبدالغفور سرورؔ اور غلام غوث بیخبر کی مدد سے یہ مجموعہ جو (188) صفحات پر مشتمل ہے مرزا غالبؔ کی زندگی میں 1868ء

کو مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع کیا جس میں منشی ممتاز کا دیباچہ، غلام مولا صاحب قلق کی تقریظ اور کچھ تاریخی قطعات ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر خارج از محل نہیں کہ غالبؔ پہلے تمام خطوط فارسی میں لکھتے تھے لیکن 1849ء سے انھوں نے اُردو میں اس نئے طرز کی خطوط نگاری کی جو مکالمہ نگاری ہے۔ عودِ ہندی کا تاریخی قطعہ کا شعر یہ ہے۔

موسوم کیا جو مہرِ غالبؔ سے سرورؔ　　　تاریخ بھی اس کی ''مہرِ غالب'' لکھتی

اُردوئی معلّٰی : مرزا غالبؔ کے خطوط کا پہلا حصہ 464 صفحات پر مشتمل غالبؔ کے انتقال کے بیس دن بعد شائع ہوا۔ قربان علی بیگ سالکؔ نے تاریخ کہی

ہے یہی سال طبع سال وفات
''آج اون کا سخن تمام ہوا''

1285 ھجری

اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع مجتبائی سے شائع ہوا جس میں حصہ اول اور دوم دونوں کو یکجا کر دیا گیا اور یہ کام حالیؔ کی زیرِ نگرانی انجام پایا۔ اُردوئی معلّٰی کے مزید ایڈیشن کریمی پریس لاہور اور شیر محمد سرخوش نے بھی شائع کیے اور آج بھی مسلسل شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مکاتیبِ غالبؔ : غالبؔ کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو 1857ء سے 1865ء تک والیانِ رام پور نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خان اور بعض دوسرے صاحبان کو غالبؔ لکھتے رہے ان (130) مکتوبات کو امتیاز علی خان عرشیؔ نے یکجا کر کے دیباچہ کے ساتھ 1937ء میں شائع کیا اور اس جمع آوری میں عرشیؔ نے ریاست کی طرف سے بھیجے گئے خطوط کی نقل بھی حاشیوں میں لگا دی۔

نکاتِ غالبؔ : یہ بیس (20) صفحات پر مشتمل مختصر سا رسالہ ہے جو فارسی زبان کی صرف قواعد ہے جو اُردو میں لکھی گئی۔

رقعاتِ غالبؔ : یہ سولہ صفحات پر مشتمل مختصر سا رسالہ ہے جس میں پنج آہنگ سے منتخب شدہ (15) پندرہ فارسی مکتوب ہیں۔

دونوں رسالے مطبع سراجی سے شائع ہوئے جو ماسٹر پیارے لال آشوب کی درخواست پر غالبؔ نے تشکیل دیئے اور پھر دوبارہ شائع نہ ہوسکے۔

قادر نامہ : یہ آٹھ صفحات کا مختصر رسالہ ہے جس میں (137) اشعار ہیں۔ یہ رسالہ غالبؔ نے عارف کے بیٹوں باقر علی اور حسین علی کی تعلیم کے لئے خالق باری اور آمد نامہ کی طرز پر لکھا جس میں اُردو اور فارسی ہم معنی لغات ہیں۔ اس کا پہلا شعر لفظ قادر سے شروع ہوتا ہے اس لئے اس کو "قادر نامہ" کہا گیا۔

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا
ہے نبیؐ مرسل پیمبر رہنما

قادر نامہ 1864ء میں مجلس پریس دہلی سے شائع ہوا۔ اور اس کے مختلف ایڈیشن شائع ہوئے۔

نادراتِ غالبؔ : یہ غالبؔ کے اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو غالبؔ نے منشی نبی بخش حقیرؔ اکبر آبادی کو لکھے تھے۔ ان (72) خطوط میں (69) خطوط غیر مطبوعہ تھے جنھیں آفاق حسین دہلوی نے 1947ء میں ادارہ نادرات کراچی کی جانب سے شائع کروایا۔

انتخابِ غالبؔ : غالبؔ نے اس مختصر کتاب کو پنجاب کے کیشنر میکلوڈ صاحب کی فرمائش پر مرتب کیا تھا اس (48) صفحات کی کتاب کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّہ میں کچھ نثریں، خطوط، لطیفے، اور دوسرے حصّے میں منتخب اشعار ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار 1943ء میں دین محمدی پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

نامہ غالبؔ : غالبؔ نے 1865ء میں یہ سولہ (16) صفحہ کا خط مطبع محمدی دہلی سے چھپا کر تقسیم کروایا جس میں ساطع برہان جو غالبؔ کی قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی تھی اس کا جواب تھا۔ نامہ غالبؔ اب عودِ هندی کا جزو بن گیا ہے۔

تیغِ تیز : غالبؔ نے یہ (34) صفحات کا رسالہ قاطع برہان کے جواب میں احمد علی احمدؔ کی کتاب مویّد برہان کے جواب میں لکھا جو 1867ء میں مطبع اکمل المطابع سے صرف ایک بار شائع ہوا۔

شجرہ غالب

(پردادا)

شہزادہ ترسم خان

(خاندان شاہی سمرقند)

(دادا)

قوقان بیگ

عبداللہ بیگ (والد) — نصر اللہ بیگ (چچا)

اسداللہ خاں (وفات 1869) — یوسف مرزا خاں (وفات 1857)

(7 اولادیں کوئی بھی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا)

☆ غالب کی ماں عزت النساء بیگم آگرے کے ممتاز رئیس خواجہ غلام حسین خاں کی صاحبزادی تھی۔

☆ غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم نواب الٰہی بخش خاں برادر والی لوہارو کی صاحبزادی تھی۔ غالب کی پہلی برسی کے دن 1870ء فروری میں انتقال کر گئیں۔

☆ زین العابدین عارف غالب کی اہلیہ کی بہن بنیادی بیگم کے صاحبزادے تھے۔ دو شادیاں کیں۔ دونوں بیویاں عارف کی زندگی میں انتقال کر گئیں۔ عارف نے بھی 1852ء میں انتقال کیا۔ عارف کی عمر 36 برس تھی۔

☆ باقر علی اور حسین علی عارف کے بیٹے تھے۔ حسین علی عارف کے مرنے کے بعد غالب کے گھر رہتے تھے۔
حسین علی خاں 1850ء میں پیدا ہوئے اور تیس (30) سال کی عمر میں 1880ء میں انتقال کر گئے۔
باقر علی خاں 1848ء میں پیدا ہوئے اور اٹھائیس (28) سال کی عمر میں 1867ء میں انتقال کر گئے۔
باقر اُردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور قربان علی سالک سے اصلاح لیتے تھے۔

مذہب : مرزا غالبؔ کے اجداد ماورائی النہری تھے۔اُن کا مذہب حنفی تھا۔لیکن بقول غالبؔ

ع۔ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

اِس لئے غالبؔ کے مذہب کے بارے میں گفتگو ہوتی رہتی ہے۔اگر چہ غالب کی ذات مذہبی بندشوں سے اونچی تھی لیکن تحقیق کا تقاضہ تمام زاویوں پر روشنی ڈالنا ہے چنانچہ یہاں ہم اپنا نظریہ دیئے بغیر لفظ بہ لفظ من وعن مشاہیر کے بیانات رقم کر کے قاری کو نتیجہ اخذ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی خارج از محل نہیں کہ غالبیات کے اکثر ماہرین نے ان کے عقیدہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے جب کہ غالبؔ کے اشعار کی تنقید میں بال کی کھال نکالی ہے۔غالبؔ کی نجی زندگی پر تبصروں میں ولایتی شراب کے نام اوران کے دام تک ملتے ہیں لیکن ان کے نعتیہ اور منقبتی کلام کے جام کا ذکر تک نہیں ملتا۔ غالبؔ کے عقیدے کا غالبؔ کی سوانح عمری لکھنے والوں کے جملوں کو سند بنا کر فیصلہ کیا جاتا ہے جبکہ خود غالبؔ کے کلام میں واضح طور پر ان مسائل پر گفتگو ہے اور جو ان کے دیوان میں موجود ہے اور جس کو راقم نے اس دیوان نعت ومنقبت میں یکجا کیا ہے۔ان اشعار کے مطالب ومعانی کو سمجھنے کے لئے افلاطون کی ذہانت اور ارسطو کی فطانت کی ضرورت نہیں بلکہ عقل سلیم کشادہ قلبی اور فیصلہ کن عقل کی ضرورت ہے۔

ا۔مولانا محمد حسین آزادؔ آب حیات میں لکھتے ہیں کہ" اہل راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوش محبت میں تھا نہ کہ تبرّا اور تکرار میں۔

ب۔الطاف حسین حالیؔ یادگار غالبؔ میں لکھتے ہیں۔اگر چہ مرزا کا اصل مذہب صلح کُل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیّع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیرؑ کو وہ رسولؐ خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔ایک بار مرحوم بہادر شاہ نے دربار میں کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ شیعی المذہب ہیں۔مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں جن میں تشیّع اور رفض سے تحاشی

کی تھی۔۔۔۔لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رباعیاں صرف بادشاہ کو خوش کرنے اور اہلِ دربار کو ہنسانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ کیوں کہ دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم از کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔" غالبؔ نے تمام عبادات و فرائض میں صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسری نبیؐ اور آل نبی کی محبت اور اس کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔"

راقم نے حالیؔ کے وہ بیانیات جو غالبؔ کی تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں ہیں ان کو اس لئے یہاں پیش نہیں کیئے تاکہ تکرار سے اجتناب ہو۔ حالیؔ کے وہ جملے میکش اکبر آبادی کے مضمون میں آگے صفحات میں ملیں گے۔

ج۔ عبدالباری آسیؔ شرح دیوان غالبؔ مطبوعہ **1930**ء میں لکھتے ہیں۔" مرزا اہل تشیع سے تھے مگر ان کا سارا خاندان سُنّی المذہب تھا اور وہ کسی سے تعصب نہیں رکھتے تھے چونکہ غالبؔ کے دوست اور عزیز سُنّی تھے لہٰذا ان کو کوئی مشکل سے سمجھتا تھا کہ یہ شیعہ ہیں۔"

د۔ امتیاز علی خاں عرشی دیوان غالبؔ مرتبہ عرشی میں لکھتے ہیں۔

ع۔ اولیں دور امامت طرب ایجاد بہار

ا۔ اولین دور امامت یعنی امام اول۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میرزا صاحب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہلا امام مانتے تھے۔ دوسرے قصیدے میں وصی ختم رسل کہا ہے۔ جس کا مطلب قائلین امامت کے نزدیک یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی امامت کی بھی وصیت فرمائی تھی۔ چونکہ یہ دونوں قصیدے صفر 1238ھ (نومبر **1821**ء) سے پہلے کے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب ابتدائے عمر ہی سے مسلک آبا سے منحرف ہو گئے تھے۔ ابھی تک اس تغیر عقائد کا حقیقی سبب معلوم نہ ہو سکا، سوائے اس خیال کے کہ نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر کے بیٹوں سے، جو شیعی مذہب تھے ان کا لڑکپن سے بہت میل جول تھا۔ بعض قرینے ایسے بھی ہیں کہ ان کی ننھیال کو شیعی ہونا چاہیئے (دیباچہ مکاتیب غالبؔ، طبع چہارم صفحہ ۱۸، ۱۹۔

ھ۔ جوشؔ ملسیانی شرح دیوان غالبؔ میں لکھتے ہیں۔ ”بوتراب حضرت علیؑ کا لقب ہے فرماتے ہیں اے غالبؔ دوست کے ہم نشین سے دوست کی بو آیا کرتی ہے۔ اسی خیال سے میں حضرت علیؑ کی عبادت کرتا ہوں اور اسی عبادت کے ذریعہ خدا پرستی میں مشغول ہوں۔ اگرچہ مرزا مذہبی خیالات کے آدمی نہ تھے۔ نماز بھی نہیں پڑھتے تھے روزہ بھی نہیں رکھتے تھے مگر مذہبی عقیدہ کے لحاظ سے وہ اثنا عشری یعنی شیعہ ہیں“۔

و۔ کالیداس گپتا رضا دعای صباح میں لکھتے ہیں۔ ” غالبؔ علمی اور عملی پہلو سے نہ سہی مگر جذباتی طور پر کٹر شیعہ تھے۔“

ز۔ مالک رام ذکر غالبؔ میں تفصیل سے غالبؔ کے مذہب پر بحث کرتے ہیں جس کا ہو بہو اقتباس یہ ہے :

”مرزا کے مذہب کا مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے، جن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ حالانکہ میری نظر میں ان کے عقائد سے متعلق کسی قسم کا شبہہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل اس بارے میں اختلاف اس لئے پیدا ہوا کہ حکیم محمود خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مرزا کی تجہیز و تکفین، اہلِ تشیع کے طریقے پر نہیں ہونے دی۔ اس سے بعض لوگوں نے فرض کر لیا کہ ان دونوں صاحبوں اور خاص کر نواب ضیاء الدین احمد خاں سے زیادہ کون ان کے معتقدات سے واقف ہو سکتا تھا اور جب انھوں نے تمام رسوم اہلِ تسنن کے عقیدے کے مطابق ادا کیں تو یقیناً انھیں معلوم ہوگا کہ مرزا دراصل اسی مسلک کے پیرو تھے اور شیعی نہیں تھے۔ حالانکہ یہ سراسر مغالطہ ہے۔ جہاں تک اقرار باللسان کا تعلق ہے، مرزا ساری عمر کھلے بندوں اپنے شیعی ہونے کا اعلان کرتے رہے اور اس میں ان کے مخاطب سُنّی اور شیعہ دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے بزرگ تھے“۔ فرماتے ہیں :

”میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ، سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب تعظیم اور اپنے اپنے وقت میں مفترض الطاعت تھے۔ محمدؐ علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ

ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت۔ اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علیؑ علیہ السّلام ہے ثم حسنؑ ثم حسینؑ، اسی طرح تا مہدیؑ موعود علیہ السّلام۔

ع۔ بریں زیستم ہم بریں بگذرم

(بنام نواب علاء الدین احمد خاں۔ سنّی)

''غالبؔ، اثنا عشری حیدری''۔ (بنام غلام حسنین قدرؔ بلگرامی۔ شیعی)

''بندہ علیؑ ابن ابی طالبؑ، اسد اللہ المتخلص بغالبؔ''۔

(بنام محمد حسن ناخدائے شیرازی۔ شیعی)

''عطیۂ حضرت بتوسط جناب سیف الحق پہنچا اور میں نے اس کو بے تکلف عطیۂ مرتضوی سمجھا۔ علی مرتضیٰ علیہ التحیہ والثنا آپ کا دادا اور میرا آقا۔ خدا کا احسان ہے کہ میں احسان مند بھی ہوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا'' (بنام میر غلام بابا خان بہادر۔ سنّی)

''میں علیؑ کا غلام اور اولادِ علیؑ کا خانہ زاد'' (بنام حکیم سیّد احمد حسین مودودی۔ سنّی)

''صاحب! بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو۔ ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں۔''

(بنام مرزا حاتم علی مہرؔ۔ شیعی)

''جانتے ہو کہ علیؑ کا بندہ ہوں۔ اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔''

(بنام یوسف میرزا۔ شیعی)

''خدا کے بعد نبیؐ اور نبیؐ کے بعد امام۔ یہی ہے مذہب حق، والسّلام والاکرام، علیؑ علیؑ کیا کرو اور فارغ البال رہا کر'' (مجروحؔ۔ شیعی)

امامت من اللہ کا ثبوت انھوں نے ایک قصیدے میں یوں دینے کی کوشش کی ہے

حقا کہ لفظِ احمدؐ و لطفے کہ تحتِ اوست	گنجیست شائگاں و طلسمیست استوار
امّا پئے کشایشِ ایں معنوی طلسم	فطرت شگرف قاعدہ کرد اختیار

بایدنخست میم زاحمدؐ فرا گرفت — کاں میم اسمِ ذاتِ نبیؐ راست پردہ دار

ہر گہ بہ یُمنِ معرفتِ ذاتِ احمدی — میم ازمیانہ رفت واحد گشت آشکار

بے پردہ بنگر از الف، اللہ جلوہ گر — وزحاودال بشمر ودریاب ہشت وچار

12 = 4 + 8

اور وہ اس عقیدے پر بہت ابتدا سے قائم تھے۔ مثنوی ابرِ گہر بار غالباً **1845** میں مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے منقبت کے باب میں لکھتے ہیں۔

کہ تا کینہ از مہر بشناختم — بکس غیر حیدرؑ نہ پرداختم

جوانی بریں در، بسر کردہ ام — شبے در خیالش سحر کردہ ام

یعنی میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور کینہ اور محبت کے درمیان فرق کرنا سمجھا، اسی دن سے حضرت علیؑ کے سوائے کسی دوسرے سے سروکار نہیں رکھا اسی کے در پر جوانی کے ایام بسر کر دیئے اور اسی کی یاد میں راتیں گذار دیں۔ اور انھوں نے اس میں کوئی مبالغہ نہیں کیا۔ ان کے ابتدائی زمانے کے کلام میں جو نسخہ حمیدیہ میں چھپا ہے، اس طرح کے کئی شعر موجود ہیں۔

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسدؔ — خدا کے واسطے اے شاہِ بیکساں، فریاد

جس جگہ ہے مسند آرا، جانشینِ مصطفےٰؐ — اس جگہ تختِ سلیمانؑ، نقشِ پائے مور ہے

اسدؔ، جہاں کہ علیؑ برسرِ نوازش ہو — کشادِ عقدۂ دشوار، کارِ آساں ہے

کثرتِ اندوہ سے، حیران و مضطر ہے اسدؔ — یاعلیؑ! وقتِ عنایات ودمِ تائید ہے

حرمتِ جانِ محمدؐ، یک نظر کن سوئے من — یاعلیؑ، یامرتضیٰؑ، یاابوالحسنؑ، یابوترابؑ

یہ بیانات پڑھنے کے بعد ناممکن ہے، کہ کوئی شخص انھیں شیعانِ علیؑ کے سوائے کسی

دوسرے گروہ میں شمار کر سکے۔ لیکن یہ بھی واقع ہے، کہ ان کی شیعیت صرف اسی حد تک ہے، کہ وہ حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کو تمام دوسرے صحابہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ انھوں نے باقی صحابۂ رسول کو ستاروں اور حضرت علیؑ کو چاند سے تشبیح دی ہے۔ لکھتے ہیں۔

شرطست کہ بہرِ ضبطِ آداب ورسوم　　خیزد بعد از نبیؐ ، امامِ معصومؑ

زاجماع چہ گوئی، بہ علیؑ باز گرائے　　مہ جائے نشینِ مہر باشد، نہ نجوم

اس کی تعبیر ہم دوسرے لفظوں میں یوں بھی کر سکتے ہیں، کہ ان کی شیعیت کا امتیازی نشان تبرا نہیں، بلکہ تولا ہے، یعنی وہ دوسرے صحابہ پر تبرا نہیں کرتے، بلکہ حضرت علیؑ سے اپنے تولا ومحبت کا شدت سے اظہار کرتے ہیں۔ اب یہ کوئی مخصوص شیعی عقیدہ نہیں، بلکہ تفضیلہ سُنّی بھی یہی مسلک رکھتے ہیں۔

پس مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کی وحدانیت پر یقینِ کامل رکھتے ہیں، اور نجات کے لئے نبوت پر ایمان کو واجب سمجھتے ہیں۔ نبوت کے بعد امامتِ مرتضوی کے قائل ہیں اور اسی طرح بارہ اماموں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور امامت کے من اللہ ہونے کے معتقد ہیں۔ وہ تمام صحابہ کا ادب کرتے ہیں۔ لیکن حضرت علیؑ کو سب دوسرے صحابہ پر ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں۔ ان کے اپنے خیال میں یہ اثنا عشری شیعہ عقیدہ ہے۔ آپ چاہیں تو انھیں تفضیلی کہہ لیں۔" (مالک رام۔ ذکرِ غالبؔ)

ج۔ میکشؔ اکبرآبادی: معتبر ماہنامہ شاعر کے غالبؔ نمبر 1969 میں میکش اکبرآبادی کے مضمون "مرزا غالبؔ کا مذہب" کے اقتباسات یہاں پیش کئے جائے ہیں۔

(جناب افتخار امام صدیقی صاحب ایڈیٹر شاعر میرے شکریہ کے خاص مستحق ہیں کہ اسرع وقت میں اس مضمون کی فیکس کاپی پہنچا کر راقم پر لطف وعنایت کی)۔

مرزا غالبؔ کا مذہب کیا تھا؟ وہ شیعہ تھے یا سُنّی؟ یہ ایک سوال ہے جو ان کی زندگی میں بھی پیدا ہوا ان کی موت کے وقت بھی اور اُن کی وفات کے اتنے زمانے کے بعد بھی یہ سوال اتنا ہی محتاج جواب ہے جتنا اُن کی زندگی میں تھا۔ حالیؔ نے یادگارِ غالب

میں جو کچھ کہا ہے اس کی بنیاد حالی کا ذاتی علم اور قیاس ہے جو ایک حد تک صحیح مان لینے کے بعد بھی قطعی نہیں ہے۔

''مرزا کے جنازے پر جب کہ دلّی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی۔ راقم بھی موجود تھا اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب محمد مصطفے خاں حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم۔ اور بہت سے اہلِ سنّت اور امامیہ فرقوں کے لوگ جنازے کی مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرۂ بخشی محمود خاں نے نواب نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے۔ ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق اُن کی تجہیز و تکفین کریں مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہلِ سُنّت کے موافق ادا کئے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب صاحب سے زیادہ اُن کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور سُنّی دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ اُن کے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں اُن کا برتاؤ شیعہ اور سُنّی دونوں کے ساتھ یکساں رہا تھا، اسی طرح مرنے کے بعد بھی دونوں فرقے اُن کی حق گذاری میں شریک ہوتے''

اگر خواجہ حالی کا پہلا بیان تسلیم کر لیا جائے کہ ''دربار میں ایک متنفّس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو'' تو ان کی تجہیز و تکفین کے وقت یہ اختلاف پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن تجہیز و تکفین کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب سُنّی تھے کیونکہ بقول مولانا حالی نواب ضیاء الدین احمد خاں سے زیادہ مرزا کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہ تھا۔ ان عبارتوں سے ایک بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا غالب نہ ایسے شیعہ تھے جس میں شُبہ کی گنجائش نہ ہو اور نہ ایسے سُنّی تھے کہ اُن کو قطعیت کے ساتھ سُنّی کہہ دیا جائے۔ اس موقع پر ایک بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مذہب کے معاملہ میں شیعہ اور سُنّی دونوں علیحدہ مزاج رکھتے ہیں۔ سُنّیوں کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سُنّیوں کے پورے مذہب کے مطابق ہو اور اُس کے ساتھ حضرت علی کی تعریف و توصیف کے ساتھ جناب امیر معاویہ کے

بارے میں اتنا مخلص نہ ہو تو اُس کو قطعیت کے ساتھ شیعہ کہہ دیا جاتا ہے اور اکثر شیعہ ہونے کے لئے صرف ''حُبِّ علیؑ'' ہی کافی سمجھی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مرزا غالبؔ کوئی عالم یا مُجتہد نہ تھے جو عقائد و کلام کی جزئیات تک کے متعلق اپنا مسلک متعین یا ظاہر کرتے۔ پھر بھی انھوں نے مختلف مواقع پر جو اپنے عقائد بیان کئے ایک مرتبہ ان سب کا مجموعی طور سے مطالعہ ضروری ہے۔ یہ ضروری اقتباسات ''یادگارِ غالب'' اور اُن مکتوبات سے پیش کئے جاتے ہیں جو مرزا صاحب نے حضرت جی غمگینؒ دہلویؒ کو لکھے ہیں۔

''میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قید کیش و ملّت سے آزاد ہوں، اُسی طرح بدنامی و رُسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں'' ''لیکن اِس میں شک نہیں کہ میں مُوحّد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔'' لا الہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ''

''دریے کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے، عُرفاء کے کلام سے حقیقت حقہ وحدۃ وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسلمہ کو نبوّت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو نَو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں، دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہیں۔ میں موّحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمدؐ علیہ السلام پر نبوّت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوّت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علیؑ ہے ثم حسنؑ ثم حسینؑ۔ اسی طرح تا مہدیؑ موعود علیہ السّلام ''بریں زیستم ہم بریں بگذرم'' ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔''

مکتوبِ مرزا غالبؔ بنامِ حضرت جی غمگینؒ دہلوی : ''رُباعیوں کے بارے میں بات

شروع ہوتی ہے، یااللہ میرا ایمان پیر و مُرشد کے خلاف مزاج نہ ہو۔ تین رُباعیاں جو شروع میں رقم ہوئی ہیں ان کا مضمون یہ ہے کہ علیؑ خلیفہ تھے لیکن میرا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ میں علیؑ کو امام سمجھتا ہوں اور دوسروں کو خلیفہ۔ خلافت، سلطنت اور ریاست کے ہم معنی ہے۔ عرب کی زبان میں۔۔۔ اور حاکم کو خلیفہ کہتے ہیں۔ اگرچہ خلافت کے لُغوی معنی نیابت کے ہیں۔ غرض یہ کہ علی نبیؐ کے بعد بلا فصل امام ہیں۔ امامت خدا کی طرف سے ہے اور علیؑ امام ہیں۔ ابو بکرؓ کی خلافت کے زمانے میں بھی عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں بھی، عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں بھی۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ عثمانؓ کے بعد علیؑ خلیفہ ہوئے غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام برحق علیؑ مرتضٰی جب رسولؐ کے بعد امام ہوئے تو انہوں نے ابوبکرؓ صدیق کو خلیفہ کر کے حکومت کا کام اُن کے سپرد کر دیا تاکہ مسلمان خطروں سے محفوظ رہیں اور مسلمانوں پر فرمانروائی کریں۔ اس کے بعد عمرؓ کو پسند کیا اور اُن کے بعد عثمانؓ کو خلافت دی۔ ان تینوں نے اپنے کو سپرد کر دیا اور نبیؐ اور امامؑ کی اطاعت کی۔ عثمان کے بعد کوئی شخص حکومت کے قابل مسلمانوں میں نظر نہ آیا۔ جس شخص نے اس کی آرزو کی، وہ بھی اس کا اہل نہ تھا۔ مجبوراً امامِ وقت نے حکومت کا کام بھی خود ہی سنبھال لیا اور اہلِ اسلام کے جھگڑوں کو طے کرنے لگے۔ بادشاہ اگر قاضی کا کام کرنے لگے تو اُسے قاضی نہیں کہیں گے۔ علیؑ ہی امام ہیں اپنے عہد میں لیکن خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد بنی اُمیّہ کو منتقل ہوئی اور اُن سے آلِ عباس کو پہنچی۔ ان دونوں گروہوں نے خُلفائے ثلثہ کے برعکس بہت ظلم کئے اور خون بہائے "علیؑ اور اولادِ علیؑ کی امامت کو مٹایا اور ائمہؑ کو شہید کیا۔"

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اُس کا تعلق مرزا غالبؔ کے شیعہ اور سُنّی ہونے سے تھا۔ مولانا حالیؔ نے اُن کے متعلق جو لکھا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے:

"مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پُختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اُصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے مگر توحید

وجودی اُن کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی...... اُنہوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبیؐ اور اہل بیتؑ نبیؐ کی محبت، اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔"

ط۔ عباداللہ فارقی غالبؔ کے مذہبی اور فکری میلانات میں لکھتے ہیں۔ "مرزا نہ شیعہ تھے نہ سُنّی ان کا مذہب عشق تھا جو محبت علیؑ ابن ابی طالبؑ میں جلوہ گر ہو گیا تھا۔ مرزا کبھی کبھی وفور جذبہ میں ایسی باتیں بھی کہہ جاتے۔

شرط است کہ بہر ضبط آداب و رسوم	خیزد بعد از نبیؐ امام معصوم
از اجماع چہ گوئی بہ علیؑ باز گرائی	مہ جائے نشین مہر باشد نہ نجوم

یعنی مذہب کے قیام اور ضبط کے لئے نبیؐ کے بعد امام کی ضرورت ہے اجماع کا کیا ذکر کرتے ہو آفتاب کا جانشین ماہتاب کو ہونا چاہئے نہ کہ ستاروں کو۔

ی۔ پروفیسر نذیر احمد غالبؔ کی فارسی قصیدہ نگاری میں لکھتے ہیں۔ "غالبؔ کے قصائد میں **13** مذہبی قصیدے ہیں جن یں ایک حمد باری میں، تین نعت میں، چار حضرت علیؑ کی منقبت میں، دو حضرت امام حسینؑ، ایک حضرت عباسؑ بن علیؑ، ایک حضرت امام مہدیؑ کی منقبت میں ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ ائمہ اثنا عشر میں صرف تین اماموں کی منقبت لکھی گئی۔ حضرت امام حسنؑ اور آٹھ دوسرے ائمہ سے صرف نظر کرنا تعجب خیز امر ہے، معلوم نہیں اس رد و قبول کے پیچھے کوئی جذبہ کارفرما ہے کہ یہ محض اتفاقی امر ہے۔ موجودہ قصاید سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ غالبؔ شیعی عقیدے کے حامل تھے اس عقیدے کا تقاضا ہے کہ ان کو صرف تین اماموں کی مدح پر بس نہ کرنا تھا۔

(نوٹ: غالبؔ نے پورے بارہ اماموں کے نام لے کر مدح اور دعا کی ہے جو اسی کتاب میں موجود ہے۔ راقم)

ک۔ آغا محمد سلطان مرزا: فلسفہ غالبؔ **1949**ء میں لکھتے ہیں۔ "غالبؔ کی روح پر ظلم ہوگا اگر ہم غالبؔ کے فلسفۂ حیات میں حُبِّ علیؑ کا تذکرہ نہ کریں رسولؐ و آل

رسولؐ کی محبت سے غالبؔ سرشار تھے۔ سب کی منقبت کہی ہے لیکن علیؑ کا عشق تو ان کے خون کے اندر سرایت کر گیا تھا۔ کہتے ہیں۔

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست مشغول حق ہوں بندگی بوترابؑ میں

نفس نبیؐ خدائے نصیری امام خلق آں منت عظیم کہ حق بر جہاں نہاد

شمعی ز آتش شجر طور بر فروخت واں را بخلوت علیؑ اللہیاں نہاد

آں حضرت کی معراج سے واپسی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

شب از بادۂ قدس ساغر گرفت صبوحی ز دیدار حیدرؑ گرفت

دو ہمراز از باہمد گر راز گوے نشاں ہائے بینش بہم باز گو

آپ نے غور کیا ''صبوحی ہم از بادۂ دوش بود'' مست مئے حُبّ علیؑ اپنے شرابیوں کی اصطلاح میں بڑی بات کہہ گیا۔ بات وہی ہے اگر شجر میں کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ''انی انا اللہ'' تو نہاں خانہ خلوت سے علیؑ کے لہجہ میں گفتگو ہونا کون سی ناممکن بات تھی۔ آخر گفتگو کے لئے کوئی لہجہ تو اختیار کرنا ہی تھا۔ وہ وہی لہجہ کیوں نہ ہو جو دونوں کو مرغوب ہے۔

ل۔ یوسف جمال انصاری، غالبؔ اور تصوف میں لکھتے ہیں۔ '' غالبؔ کے مذہبی عقائد کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موحّد تھے اور بطور ایک مسلمان کے اثنا عشری طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ محمد ﷺ کو خاتم النبیین مانتے تھے۔ ائمہ معصومین کے قائل تھے۔ اس قسم کے عقائد راسخ العقیدہ اثنا عشری حضرات کے ہوتے ہیں۔ انھیں حُبّ علیؑ کی وہ دولت ملی تھی اور عشق حسینؑ کا وہ خزانہ ہاتھ آیا تھا اور جملہ عقلی حدود سے متجاوز ہو جاتے چنانچہ جذباتی اعتبار سے نصیری عقاید کی مماثلت بھی کلام غالبؔ میں جا بجا ملتی ہے۔

منصور فرقۂ علیؑ اللّٰہیاں منم　　　　آوازۂ انا اسد اللّٰہ بر آورم

اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مذہبی عقیدے کے اعتبار سے غالبؔ اثنا عشری تھے لیکن شاعر کی نفسیات کچھ اس قسم کی ہوا کرتی ہے"۔

م۔ پروفیسر البرٹ تھائی لے اور پروفیسر انا ماری شمل، مرزا اسد اللہ غالبؔ میں لکھتے ہیں۔" غالبؔ نے فارسی زبان میں قدیم انداز میں ستر (70) قصیدے لکھے ہیں۔ ان میں حمدیہ بھی ہیں نعتیہ بھی اور حضرت علیؑ کرم اللہ وجہ کی منقبت میں بھی۔ غالبؔ شیعی المذہب تھے حالانکہ ان کے خاندان کے دوسرے افراد مسلک اہل السنّت والجماعت کے پیرو تھے۔"

ن۔ پروفیسر الی ساندرا بوسانی۔ غالبؔ کی فارسی شاعری میں لکھتے ہیں۔" غالبؔ شیعہ تھے اور اپنے کلام میں اکثر شیعہ اماموں کی تعریف کرتے ہیں۔"

ص۔ حسرت موہانی تذکرہ الشعرا میں لکھتے ہیں۔" کسی کو ان کے اصلی مذہب کی بابت سوا اس کے اور کچھ نہ معلوم ہوا کہ ان کو اہلبیتؑ رسالت سے بے انتہا عشق تھا اور بس۔ غالباً مرزا شیعہ تفضیلہ تھے۔"

خ۔ ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط "عظمتِ رسولؐ خطوط غالبؔ" میں لکھتے ہیں۔" غالبؔ کو دہری رافضی، شیعہ، سنی، آدھا مسلمان جو کچھ کہا گیا ہو لیکن عشق رسولؐ سے ان کا قلب منور تھا اور روح بالیدہ"۔

ض۔ ادیب رائے پوری" غالبؔ کے فارسی کلام میں نعت" میں لکھتے ہیں۔" اگرچہ غالبؔ نے اپنی عقیدت اور رسولؐ سے اپنی بے پناہ محبت کے اظہار میں لاتعداد اشعار نظم کی صورت اُردو اور فارسی میں کہے لیکن حُبِّ رسولؐ کا ایک ایسا نمونہ غالبؔ نے اپنی نثر میں چھوڑا ہے جو یقیناً اس کی نجات کا باعث بنے گا اور اہلِ جہاں کو حُبِّ رسولؐ کا درس بن کر زبان و بیان کی تاریخ میں مہر و ماہ کی طرح روشن رہے گا"۔ نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کو اپنے خط میں لکھتے ہیں۔" اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہوؤں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز

کروں گا تا کہ مشرکین اور منکرین نبوت مصطفویؐ اور امامت مرتضویؑ اس میں جلیں۔"

شاگرد : غالبؔ کے شاگردوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مالک رام نے تلامذۂ غالبؔ میں (175) سے زیادہ شاگردوں کے حالات کتابی شکل میں جمع کیے۔ اُردو کے چار عظیم شاعروں میں یعنی میرؔ، انیسؔ، اقبالؔ اور غالبؔ میں غالبؔ اس لئے بھی منفرد رہے کہ دوسرے تینوں شعرا کے شاگردوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ حالیؔ نے اس کثرت کو غالبؔ کی وسعت اخلاق اور عام رضا جوئی کی وجہ قرار دے کر لکھا کہ جو شخص اصلاح کے لئے ان کے پاس غزل بھیجتا تھا ممکن نہ تھا کہ وہ اس کے خط میں اُس کی غزل میں اصلاح دے کر نہ بھیجیں۔

یہ سچ ہے کہ ان کے شاگردوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ یوسف علی خاں ناظمؔ بیتابؔ اور توفیقؔ جیسے والیاں ریاست، ظفرؔ جیسا بادشاہ مغل، حالیؔ، شیفتہؔ، حقیرؔ اور عرشیؔ جیسے عالم فاضل تفتہؔ، ذکاؔ جیسے ملازمت پیشہ افراد کے علاوہ بہت سے معمولی پڑھے لکھے عام لوگ شامل تھے۔ ان کے ارشد تلامذہ میں حالیؔ، شیفتہؔ، نیّر رخشاںؔ، عارفؔ، سالکؔ، مجروحؔ، علائیؔ اور تفتہؔ وغیرہ شمار ہوتے تھے۔ غالبؔ کا طریقہ اصلاح آموز شانا اور صحت مندانہ تھا۔ جو شعر پسند آتا اُس پر صاد کی علامت لگاتے اور بعض اوقات شاگرد کا دل بڑھانے کے لئے تعریفی کلمات لکھ دیتے۔ اگر کسی لفظ کے بدل دینے سے شعر عمدہ اور بلند ہو جاتا تو شعر کے نیچے وہ لفظ لکھ دیتے۔ غالبؔ کی کوشش یہ ہوتی کہ شاعر کا خیال حتی الامکان وہی باقی رہے وہ صرف استادی دکھانے کے لئے لفظوں کی رد و بدل نہیں کرتے تھے جس سے مضمون میں ترقی نہ ہو۔ غالبؔ کے شاگردوں کو معلوم تھا کہ اصلاح کے لئے اچھے کاغذ پر خوش خط اشعار لکھیں جائیں تا کہ اشعار کے درمیان اصلاحی نکات رقم ہو سکے۔ چونکہ غالبؔ کا طرز بیاں منفرد تھا اس لئے ان کے ان تمام شاگردوں میں سے کوئی بھی شاگرد اُس جوہر نایاب کو پا نہ سکا اور غالبؔ نے بھی اپنا نقش بنانے کی کوشش نہ کی۔ غالبؔ کے خطوں میں شاگردوں کے لئے بہت سے اشارے ملتے ہیں۔ اصلاح سخن کے

ساتھ ساتھ وہ شاگردوں کے نجی اور شخصی معاملات میں بھی مدد کرتے تھے۔ غالبؔ نے استادی سے نہ اپنا سکّہ جمایا اور نہ سکّہ بنایا بلکہ سیکھنے والوں کو طریقوں پر سکھایا۔

ازدواجی زندگی	:	غالبؔ ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے دن میں دو چار بار زنانے میں جاتے ان کی اہلیہ خدمت گزاری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتی تھی۔ اگرچہ وہ غالبؔ کے برعکس متقی پرہیزگار نماز و روزہ کی پابند تھی لیکن ہر حال میں وہ غالبؔ کی پرستار تھیں۔ چنانچہ غالبؔ کے انتقال کے ایک سال بعد برسی کے دن اس دارِ فنا سے کوچ کر گئیں۔
آخری ایام	:	ناتوانی کے باعث چلنا پھرنا بند ہو گیا تھا۔ دن رات پلنگ پر پڑے رہتے۔ خطوں کے جواب یا خود لکھتے یا لکھواتے۔ مرنے سے چند روز قبل تھوڑی دیر کے لئے بے ہوش اور ہوش میں ہوتے۔ بقول حالیؔ مرنے سے دو دن قبل نواب علائی کو خط میں لکھوایا۔ ''میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں میرے ہمسایوں سے پوچھنا''۔ آخری پہروں یہ شعر وردِ زباں تھا۔

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

تاریخِ وفات	:	**15** فروری **1869** بروز شنبہ دو پہر ڈھلے انتقال کر گئے۔ یہ افسوس ناک خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی اور زیارت کے لئے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔
نمازِ جنازہ	:	دلّی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی۔ شہر کے ممتاز اور عمایدلوگ جو ہر گونہ مذہب و ملّت سے تعلق رکھتے تھے جلوس جنازہ میں شریک ہوئے۔
مدفن	:	حضرت نظام الدین اولیا کے مزار کے قریب اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں کے پہلو میں دفن ہوئے۔
تاریخِ وفات	:	کئی تاریخیں کہی گئیں۔ مشہور تاریخ ''آہ غالبؔ بمرد'' جس میں دس بارہ آدمیوں کو توارد ہوا۔ قطعات کے علاوہ حالیؔ، مجروحؔ، تفتہؔ، اور سالکؔ نے اُردو اور فارسی میں غالبؔ پر مرثیہ لکھے۔

جدول

دیوان نعت و منقبت

کل اشعار دیوان نعت و منقبت

(2888)

کل اشعار دیوان نعت و منقبت (فارسی)

(2649)

کل اشعار دیوان نعت منقبت (اُردو)

(239)

جدول دیوانِ نعت و منقبت

شمارہ	موضوع صنف	زبان	ہیئت	در حال	مطلع	تعداد شعر	ملاحظات
1	حمد	فارسی	قصیدہ	باری تعالیٰ	ای زوھم غیر غوغا در جہاں انداختہ گفتہ خود حرفی و خود را در گماں انداختہ	52	
2	حمد	فارسی	مثنوی	باری تعالیٰ	سپاسی کز و نامہ نامی شود سخن در گزارش گرامی شود	114	مثنوی ابر گہر بار کا دیباچہ ہے
3	مناجات	فارسی	مثنوی	باری تعالیٰ	خدایا زبانی کہ بخشیدۂ بہ نہروئے جائیکہ بخشیدۂ	101	مثنوی ابر گہربار کا حصہ ہے
4	مناجات	فارسی	غزل	چودہ معصومینؑ	بہر ترویح نبیؐ حاکم ادیان و ملل کار فرمای نبوت ابداً ھم ز ازل	20	غالبؔ نے چودہ معصومینؑ کا نام لے کر مناجات کی اور اس کا نام فاتحہ کہا
5	مناجات	فارسی	غزل	چودہ معصومینؑ	بہر ترویح جناب ولی یوم الحساب ضامن تعمیر شارستان دلہای خراب	67	غالبؔ نے چودہ معصومینؑ کا نام لے کر مناجات کی اور اس کا نام فاتحہ کہا
6	نعت	فارسی	قصیدہ	حضور اکرم	آن بلبلم کہ در چمنستانِ شاخسار بود آشیان من شکن طرۂ بہار	101	
7	نعت	فارسی	قصیدہ	حضور اکرم	مرا دلیست بہ پس کوچۂ گرفتاری کشادہ روی ترا ز شاھدان بازاری	65	
8	نعت	فارسی	قصیدہ	حضور اکرم	کیستم تا بخروش آوردم بی ادبی قدسیاں پیش تو در موقف حاجت طلبی	16	خمسہ بر غزل قدسیؔ

شمارہ	موضوع صنف	زبان	ہیئت	درحال	مطلع	تعداد شعر	ملاحظات
9	نعت	فارسی	غزل	حضورؐ اکرم	حق جلوہ گر ز طرز بیان محمدؐ ست ارے کلام حق بہ زبان محمدؐ ست	9	
10	نعت	فارسی	مثنوی	حضورؐ اکرم	بنام ایزد اے کلک قدسی صریر بہر جنبش از غیب نیرو پذیر	57	مثنوی ابر گہر بار کا حصہ ہے
11	نعت	فارسی	مثنوی	حضورؐ اکرم بیان معراج	ہمانا در اندیشۂ روزگار شبے بود سر جوش لیل و نہار	281	مثنوی ابر گہر بار کا حصہ ہے
12	نعت	فارسی	رباعی	حضورؐ اکرم	ع۔ شب چست سویدای دل اہل کمال	2	
13	نعت	فارسی	قطعہ	حضورؐ اکرم	ع۔ سہ تن ز پیمبران مرسل	2	
14	نعت	فارسی	قطعہ	حضورؐ اکرم	تابود چار عید در عالم	2	
15	نعت	اُردو	فردیات	حضورؐ اکرم	اُس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند واسطے جس شہؐ کے غالب گنبد بے در کھلا	5	
16	نعت بشمول منقبت	فارسی	قصیدہ	حضورؐ اکرم حضرت علیؓ	چون تازہ کنم در سخن آئین بیاں را آواز دھم شیوہ رباھم نفساں را	55	
17	نعت و منقبت	فارسی	مثنوی	حضورؐ اکرم حضرت علیؓ	بعد حمد ایزد و نعت رسولؐ می نگارم نکتۂ چند از اصول	129	
18	منقبت	فارسی	قصیدہ	حضرت علیؓ	خواھم کہ ھمچو نالہ زدل سر بر آورم دود از خود و شرارہ ز آذر بر آورم	59	
19	منقبت	فارسی	قصیدہ	حضرت علیؓ	دوش آمد و بوسہ لبم بر دھان نہاد راز دھان خویش بلب درمیان نہاد	72	
20	منقبت	فارسی	قصیدہ	حضرت علیؓ	صبحی کہ درھوای پرستاری وثن جنبد کلید بتکدہ دردست برھمن	45	
21	منقبت	فارسی	قصیدہ	حضرت علیؓ	نازم بہ گراں ما یگی دل کہ ز سودا ھر قطرۂ خون یافتہ پرواز سویدا	110	

شمارہ	موضوع صنف	زبان	ہیئت	درحال	مطلع	تعداد شعر	ملاحظات
22	منقبت	فارسی	ترکیب بند	حضرت علیؑ	آں سحرخیزم کہ مسلمادر شبستان دیدہ ام شب نشیناں مادرین گردندہ ایوان دیدہ ام	90	
23	منقبت	فارسی	مخمس	حضرت علیؑ	در مہد دستبرد بہ اژدر کند علی رفع نزاع باز و کبوتر کند علی	18	خمسہ برغزل مولانا رومؒ
24	منقبت	فارسی	مثنوی	حضرت علیؑ	ہزار آفریں بر سخن و دہن من کہ منعم پرستیست آئین من	128	مثنوی ابر گہر بار کا حصّہ ہے
25	قصیدہ	اُردو	قصیدہ	حضرت علیؑ	ساز یک ذرّہ نہیں فیض چمن سے بیکار سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار	110	
26	قصیدہ	اُردو	قصیدہ	حضرت علیؑ	دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں	67	
27	منقبت	فارسی	قصیدہ	امام حسینؑ	مگر مرا دل کافر بود شب میلاد کہ ظلمتش دھد از گور اهل عصیاں باد	112	
28	منقبت	فارسی	قصیدہ	امام حسینؑ	ابر اشکبار و ما خجل از ناگریستن دارد تفاوت آب شدن تا گریستن	63	
29	قصیدہ	فارسی	قصیدہ	امام حسینؑ	بیا در کربلا تا آن ستم کش کارواں بینی کہ دروی آدم آل عبا را ساربان بینی	62	
30	منقبت	فارسی	قصیدہ	امام مہدیؑ	ھست از تمیز گر بہ ھما استخوان دھد آئین دھر نیست کہ کس رازیاں دھد	77	
31	منقبت	فارسی	قصیدہ	حضرت عباسؑ	آوارۂ غربت نتوان دید صنم را خواہم کہ دگر بت کدہ سازند حرم را	50	
32	منقبت	فارسی	فردیات	حضرت علیؑ	منصور فرقۂ علی اللهیاں منم آوازہ ای انا اسد اللہ در افگنم	24	

شمارہ	موضوع صنف	زبان	ہیّت	درحال	مطلع	تعداد شعر	ملاحظات
33	منقبت	اُردو	فردیات	حضرت علیؑ	غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست مشغول حق ہوں بندگی بوترابؑ میں	20	
34	منقبت	فارسی	رباعی	حضرت علیؑ	ع۔ شرطیست کہ بہر ضبط آداب و رسوم	2	
35	منقبت	فارسی	رباعی	حضرت علیؑ	ع۔ بردل از دیدہ فتحِ بابیست ایں خواب	2	
36	منقبت	اُردو	قطعہ	معصومینؑ	فکر تاریخ سال میں مجھ کو	7	یہ غالبؔ نے تاریخ کہی
37	مرثیہ	فارسی	ترکیب بند	امام رضاؑ و سیدالعلما	زین خرابی کہ در جہان افتاد بگزر از خاک کاسمان افتاد	84	☆
38	ترجمہ دعای صباح	فارسی	مثنوی	دعاے حضرت علیؑ	ای خدا اے داورا کو بر کشاد از درخشیدن زبان بامداد	120	غالبؔ نے منظوم ترجمہ حضرت علیؑ کی مشہور دعا صباح کا کیا۔
39	ترجمہ دعای امام سجادؑ	فارسی	غزل	دعا امام سجادؑ	یا الٰہی قلب من محجوب و تنگ عقل من مغلوب و نفس من چنگ		امام زین العابدینؑ کی دعا کا فارسی ترجمہ
40	مرثیہ	اُردو	مسدس	امام حسینؑ	ع۔ سہل اے نفس بادِ سحر شعلہ فشاں ہو	9	
41	سلام	اُردو	غزل	امام حسینؑ	سلام اُسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو تو پھر کہیں کہ کچھ اس کے سوا کہیں اس کو	21	
42	نوحہ	فارسی	غزل	امام حسینؑ	ای کج اندیشہ فلک حرمت دین بایستی علم شاہ نگوں شد نہ چنین بایستی	12	

☆ غالبؔ نے یہ مرثیہ سیدالعلما سید حسین فرزند سید دلدار علی غفران مآب کے انتقال پر لکھا اور تاریخ کہی۔ مرحوم نے 18 صفر کو انتقال کیا جو امام رضاؑ کی شہادت کی تاریخ ہے تو اس نسبت سے امام رضاؑ کا مرثیہ بھی لکھا

شمارہ	موضوع صنف	زبان	ہیئت	درحال	مطلع	تعداد شعر	ملاحظات
43	نوحہ	فارسی	غزل	آلِ عباؑ	شد صبح بدان شور کہ آفاق بہم زد ماناکہ زخون ریزئی فاطمہؑ دم زد	11	
44	نوحہ	فارسی	غزل	امام حسینؑ	سرو چمن سروری افتاد ز پا ھای شد غرقہ بخون پیکر شاہ شہدا ھای	14	
45	نوحہ	فارسی	غزل	آلِ عباؑ	ای فلک شرم از ستم بر خاندان مصطفیؐ داشتی زین پیش سر بر آستان مصطفیؐ	11	
46	نوحہ	فارسی	غزل	شہدائے کربلا	وقتیست کہ در پیچ وخم نوحہ سرائی سوز دنفس نوحہ گر از تلخ نوائی	14	
47	حمد	فارسی	مثنوی	باری تعالیٰ	حکایت۔ شنیدم کہ شاہی دریں دیر تنگ ز پہلو بروں راند لشکر بجنگ (145) شعر	441	حکایت، مغنی نامہ اور ساقی نامہ نامکمل مثنوی ابر گہر بار کے حصّے ہیں جن کو علیحدہ خانوں میں مشکل سے تقسیم کیا جاسکتا ہے
48	نعت	فارسی	مثنوی	حضور اکرم	مغنی نامہ۔ مغنی دگر زخمہ بر تار زن گل از نغمۂ تر بدستار زن (140) شعر		
49	منقبت	فارسی	مثنوی	حضرت علی	ساقی نامہ۔ بیا ساقی آئین جم تازہ کن طراز بساط کرم تازہ کن (156) شعر		

جدول دیوان نعت و منقبت

شمارہ	صنف	تعداد	تعداد شعر
1	حمد	2	166
2	مناجات	3	166
3	نعت	5	248
4	معراج نامہ	1	281
5	نعتیہ رباعی	1	2
6	نعتیہ قطعہ	2	4
7	نعتیہ اُردو مفرد اشعار	5	5
8	نعت و منقبت امام علیؑ	2	184
9	منقبت امام علیؑ فارسی	7	522
10	منقبت امام علیؑ اُردو	2	177
11	منقبت امام حسینؑ فارسی	3	237
12	منقبت امام مہدیؑ فارسی	1	77
13	منقبت حضرت عباسؑ فارسی	1	50
14	منقبتی فارسی مفرد اشعار	24	24
15	منقبتی اُردو مفرد اشعار	20	20
16	منقبتی رباعیات فارسی	2	4
17	منقبتی قطعہ اُردو	1	7
18	مرثیہ امام رضاؑ اور سید العلما	1	84
19	دعای صباح (ترجمہ)	1	120
20	دعای امام زین العابدینؑ (ترجمہ)	1	7
21	مرثیہ اُردو	1	9
22	سلام اُردو	1	21
23	نوحے فارسی	5	62
24	مثنوی ابرِ گہربار (حکایت)	1	145
25	مثنوی ابرِ گہربار (معنی نامہ)	1	140
26	مثنوی ابرِ گہربار (ساقی نامہ)	1	156

جدول دیوان نعت و منقبت

کُل حمدیں = 2

کُل مناجاتیں = 3

کُل نعتیں = 8

کُل نعتیہ رباعیات = 1

کُل نعتیہ قطعات = 2

کُل نعتیہ مفرد اشعار = 5

کُل منقبتیں = 16

کُل منقبتی رباعیات = 2

کُل منقبتی قطعات = 1

کُل منقبتی مفرد اشعار = 44

کُل مرثیے = 2

کُل سلام = 1

کُل نوحے = 5

دعای صباح = 1

دعای امام زین العابدینؑ = 1

مثنوی ابرِ گہربار (حکایت) = 1

مثنوی ابرِ گہربار (مغنّی نامہ) = 1

مثنوی ابرِ گہربار (ساقی نامہ) = 1

کُل اشعار دیوان نعت و منقبت = 2888

غالبؔ اور ذوقؔ

(ادبی معرکہ یا ادبی مغالطہ)

اسے بھی زمانے کی ستم ظریفی ہی کہیے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے اردو شاعری میں غالبؔ اور ذوقؔ کا موازنہ کیا جاتا ہے، یعنی ذوقؔ کو غالبؔ کے مقابل میں کھڑا کیا جاتا ہے اور غالبؔ و ذوقؔ کی باہمی چشمک، جو ہم عصر اور درباری اُردو شاعر ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی، اس کو دو عظیم شاعروں کی معرکہ آرائی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سوداؔ اور ضاحکؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ، ناسخؔ اور آتشؔ، انیسؔ و دبیرؔ کی ادبی معرکہ آرائیاں مشہور ہیں اور ان کا موازنہ بڑی حد تک صحیح ہے کیونکہ یہ مقابلی شعرا ادبی میدان پر آج بھی ایک دوسرے کے ہم پلّہ اور ہم وزن نظر آتے ہیں۔ ذوقؔ کا کسی حد تک موازنہ ان کے استاد شاہ نصیرؔ سے تو کیا جا سکتا ہے لیکن غالبؔ سے ان کا موازنہ ایک وقتی ادبی سیاست اور بدعت، ادبی سنت میں تبدیل ہوگئی اور آج اس سے انکار، ادبی شریعت سے بغاوت تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میاں ابراہیم ذوقؔ اردو ادب کے اچھے شاعروں میں تھے جیسا کہ انھوں نے خود دعویٰ کیا تھا: ع۔ ہر فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا...... یقیناً بہادر شاہ ظفرؔ کے چار دیوانوں میں سے تین دیوانوں پر استاد ذوقؔ کا اثر اس قدر شدید ہے کہ بعض اوقات پڑھنے والے کو ذوقؔ کے کلام کا گمان ہونے لگتا ہے۔ قصیدہ نگاری میں مرزا سوداؔ کے بعد انھوں نے خاص مقام تو پیدا کیا لیکن غزل گوئی میں وہ کمال پیدا نہ کر سکے۔ مرحوم نیازؔ فتح پوری ''دلّی اسکول کے چار شاعر'' میں لکھتے ہیں : ''ایسا نہیں کہ ذوقؔ نے غزلیں نہ کہی ہوں، کہیں اور بہت کہیں، لیکن معیاری غزل ان کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ میرؔ کا انداز تو انھیں کیا نصیب ہوتا، میرؔ کے شاگردوں کی بھی ہمسری حاصل نہ ہو سکی۔''

غالبؔ اور ذوقؔ کا موازنہ حقیقت میں : ع۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک کا مصداق بن جاتا ہے مزے کی بات یہ ہے کہ اس معرکہ میں غالبؔ کو حملہ آور اور فتنہ گر بتا کر ذوقؔ کو مظلوم اور متین دکھایا جاتا ہے۔ غالبؔ نابغہ روزگار، یکتائے فن، فریدِ عصر اور پیغمبرِ سخن تھے۔ خدائے سخن میر تقی میرؔ کے بعد وہ ملک سخن کے بے تاج بادشاہ تھے، چنانچہ ذوقؔ کا ملک الشعرا کا خطاب، خاقانیِ ہند کا لقب، شاعروں اور مشاعروں میں آؤ بھگت، قلعہ کے شہزادوں میں عزت، دربار میں استادی کا شرف اور دہلی کے گلی کوچوں میں استادِ ظفرؔ ہونے کی سعادت و معرفت، جو حقیقت میں غالبؔ کا حق تھا، اسے غالبؔ اپنی حق تلفی تصور کرتے تھے اور دربار میں رسائی کی رکاوٹ کو ذوقؔ کی

سیاست سمجھتے تھے۔ چونکہ غالبؔ ایک حسّاس عظیم آرٹسٹ تھے اس لیے ان زیادتیوں کا اظہار اپنی باریک بینی اور ندرت بیانی سے کبھی کبھار کر دیتے۔ کیونکہ غالبؔ یک و تنہا تھے۔ ایک عصا پکڑ کر چلتے تھے جس پر بھی لوگوں نے اعتراض کیا تھا۔ غالبؔ کے ساتھ نہ شاہ تھا، نہ قلعہ اور نہ دربار، نہ شہزادے اور نہ ان شہزادوں کے ہوادار شودے اور شعبدہ باز جو دلّی کے کوچے گلیوں میں خبر رسانی اور سماجی ہراسانی میں مصروف تھے۔ حضرت ذوقؔ بڑی ہوشیاری سے پشت پردہ یہ تمام کام اپنے حاشیے سے لیا کرتے تھے اور غالبؔ زمانے کی نگاہ میں اس شعر کے معنی بن چکے تھے:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

قدیم کہاوت ہے کہ مرنے والے کو نیک کام، عمدہ کتاب یا ایک اچھا فرزند ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیتا ہے لیکن محمد حسین آزادؔ کی وجہ سے اس کہاوت میں ایک اچھے شاگرد کا بھی اضافہ ہو گیا یعنی ایک اچھا مخلص شاگرد استاد کو زندگیِ جاودانہ دے سکتا ہے۔ ذوقؔ کے اکلوتے فرزند مرحوم خلیفہ اسماعیل وہ کام نہ کر سکے جو محمد حسین آزادؔ کر گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر محمد حسین آزادؔ نہ ہوتے تو آج ذوقؔ گمنام ہو کر بہادر شاہ ظفرؔ اور قلعہ کے شہزادوں کی بیاضوں میں بکھرے رہتے۔ غالبؔ کو حالؔی ملے وہ بھی حالؔی تھے اور انھوں نے بڑے نازک مقامات پر ہوشیاری کے ساتھ اپنے شانے خالی کیے۔ وہ اگرچہ گلشنِ غالبؔ کے مالی بن کر اپنے گلدستہ کو سجاتے رہے اور ''یادگارِ غالبؔ'' لکھ کر یادگارِ روزگار ہو گئے لیکن آزادؔ کی طرح پرواز نہ کر سکے۔ محمد حسین آزادؔ جن کے بارے میں شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ ''اگر وہ گپ بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے''، اس آزادؔ نے ''دیوانِ ذوقؔ'' کو مقدمہ کے ساتھ مرتب کرنے کے علاوہ اپنی شاہکار تصنیف ''آبِ حیات'' میں باسٹھ (62) صفحات اپنے استاد بزرگوار پر تزئین کیے جب کہ خدائے سخن میر تقی میرؔ پر اٹھائیس (28)، مرزا غالبؔ پر سینتیس (37) اور میر انیسؔ پر صرف آٹھ صفحات سیاہ کیے۔ ''آبِ حیات'' میں ذوقؔ کی غزلوں کو آبِ حیات پلانے کی ناکام کوشش بھی کی گئی۔ ذوقؔ پر اردو نظم کا خاتمہ کیا کیونکہ ان کو ہرگز امید نہیں تھی کہ ایسا قادر کلام پھر ہندوستان میں پیدا ہوگا۔ استاد نصیرؔ کو شاگرد ذوقؔ سے حسد اور رشک کرتے ہوئے بتایا گیا۔ ذوقؔ کے حافظہ کو اس قدر قوی بتایا کہ انھیں وہ واقعات بھی یاد تھے جب کہ ان کی عمر ایک سال سے بھی کم تھی۔ پہلے دو شعر، جو حمد اور نعت کے ان کے دہن سے نکلے، وہ بالکل موزوں تھے۔ مومن خان مومنؔ سے تو ایک فی البدیہہ تاریخ منسوب ہے، لیکن آزادؔ نے استاد ذوقؔ سے کم از کم تین تاریخیں منسوب کیں۔ ذوقؔ کو کہیں صاحب نظر مؤرخ، کہیں تفسیر کبیر کا مفسّر، کبھی شیخ شبلی، کبھی بزید بسطامی،

کبھی ابوسعید ابوالخیر تو کہیں محی الدین عربی قلمبند کیا۔ ''خاقانی ہند'' کو خاقانی شیروان سے دو چند بتایا اور یہ بھی لکھا کہ استاد نے قصیدہ کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ کسی کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچا۔ بہر حال، شاگرد ہو تو ایسا جسے استاد کے منہ پر چیچک کے داغ بھی چمکدار، خوبصورت اور بھلے معلوم ہوتے ہوں۔ انھی کرشموں اور تعریفوں کو پڑھ کر نیاز فتح پوری نے کہا: ''ذوق کی شاعری ایک ایسا سیلاب تھا جو خس و خاشاک کا بڑا ڈھیر اپنے ساتھ لایا۔ پھر آزاد نے غوطہ لگا کر موتی ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی لیکن وہاں تھا کیا جو ہاتھ آتا۔ جسے آزاد نے موتی سمجھا، وہ بھی خزف ریزہ ہی نکلا۔''

''ذوق کے مداحین کی طرف سے ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب غالب نے ذوق کا یہ شعر سنا:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

تو اپنا سارا دیوان اس شعر کے عوض دینے پر آمادہ ہو گئے، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ غالب کی غلط بخشی تھی ورنہ خود غالب کے یہاں نہ جانے کتنے ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن میں ایک شعر ذوق کے دیوان پر بھاری ہے۔''

غالب کے شاگرد حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں لکھا کہ شیخ ابراہیم ذوق کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو ان سے چشمک تھی۔'' جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ ذوق اور غالب میں باہمی معاصرانہ چشمک تھی۔ غالب نے تمام زندگی بھر ذوق کی طرح کسی کی ہجو میں ایک شعر بھی نہیں لکھا۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ معاندانہ جذبات کی شدت غالب میں تھی جب کہ ذوق کے پاس یہ جذبہ کم تھا۔ ذوق صرف اردو کے شاعر تھے لیکن غالب فارسی اور اردو کے عظیم شاعر تھے۔ ان کا فارسی دیوان، جو اُردو دیوان سے چوگنا بڑا ہے، آج ہمارے دعویٰ کا زندہ ثبوت ہے۔ مشہور ہے کہ غالب نے ایک اٹھارہ انیس اشعار کا فارسی قطعہ لکھا جس میں طنز اور اشارہ ذوق پر کیا گیا۔ اس کے دو شعر اس طرح ہیں:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است
راست می گویم من و از راست سر نتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

(ترجمہ..... میری شاعری کے رنگ برنگ نقش دیکھنے کے لئے میرا فارسی کلام دیکھ! میرا اُردو کلام اس کے سامنے بے رنگ ہے۔ مجھے یہ حق بات کہتے ہوئے کوئی جھجک نہیں کہ جن چیزوں پر تجھے فخر ہے، وہ میرے لئے باعث

تنگ ہیں)۔

پروفیسر احتشام نے اپنے مضمون ذوقؔ و غالبؔ میں صحیح لکھا ہے کہ ''شعرا حساس ہوتے ہیں۔ اگر انھیں ایک دوسرے سے شکایت ہو تو تعجب نہ ہونا چاہئے۔ ذوقؔ کے مرید اور شاگرد، غالبؔ کو جا بہ جا اعتراضات کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔ معمولی معاصرانہ چشمک اور مسابقت کے جذبے کو ہوا دینے اور چنگاری بڑھا کر شعلے بنانے میں دربار کا ہاتھ زیادہ تھا۔ ذوقؔ ایک معمولی سپاہی کے اکلوتے بیٹے تھے جنھیں میر کاظم حسین بےقرارؔ نے پہلے شاہ نصیرؔ کی شاگردی اور پھر شاہ ظفرؔ کی استادی پر مامور کیا تھا۔ فلسفۂ تصوف اور حالات حاضرہ سے بے خبر 19 سالہ ملک الشعرا قلعہ کی رنگ رنگیلیوں میں مشغول تھے اور بقول آزادؔ 36 برس کی عمر میں جملہ مہنیات سے توبہ کرلی اور اس کی تاریخ بھی کہی : ع۔ اے ذوقؔ! بگوسہ بار توبہ۔ اس زمانے ولی عہد، جو آگے چل کر بہادر شاہ ظفرؔ ہوئے، ان کے استاد ہوئے اور ماہانہ چار روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ ذوقؔ نے کبھی شہزادوں اور قلعہ کی حماقتوں کی تنقید نہ کی بلکہ ان کی عشقیہ شاعری، جو چوما چاٹی سے لبریز تھی، اس کے دست و بازو بنے رہے اور خود بھی اسی رنگ میں شعر کہنے لگے :

ماتھے پر ترے جھلکے ہے جھومر کا پڑا چاند
لا بوسہ ، چڑھے چاند کا وعدہ تھا ، چڑھا چاند

اس کے برخلاف غالبؔ کا خاندان شاہی جاہ و منصب سے ہمیشہ سرفراز رہا۔ شمشیر کی جگہ جب قلم نے لی تو علم اور فضیلت کے میدان کے شہسوار بنے، اس لئے اس زمانے کے کئی مشہور عالم اور فاضل، جن میں فضل حق خیر آبادی، مولوی عبدالقادر، مجتہد سید محمد، آرزدہؔ قابلِ ذکر ہیں، ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ غالبؔ کو شعوری طور پر اپنے کمالِ فن کا شدّت کے ساتھ احساس تھا، اسی لئے زمانے کی ناشناسی کا گلہ کرتے رہے۔ غالبؔ کی شاعری چونکہ اس دور اور اس ماحول میں ایک نیا تجربہ تھا اور وہ قدیم اور قدامت پسندی کے خلاف تھے، اس لئے اس ماحول میں اجنبی جانے گئے۔ چنانچہ نواب لوہارو مرزا علاؤالدین کو لکھا: ''مجھے اپنے ایمان کی قسم! میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازہ بائیت نہیں پائی۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا''۔

پرانے استادوں کی زمینوں میں کشت کاری اور گلکاری ذوقؔ کا شوقین مشغلہ تھا، اس لئے غالبؔ نے کہا تھا :

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن ، اسدؔ
سر گشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

اور کبھی اپنی تعلّی اور داخلی کیفیت کو یوں نبھایا :

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل

غالبؔ کی مشکل اور معنی آفرین کلام کا مذاق اڑانا عام تھا۔ ان کی شاعری کو "ڈیڑھ جز" کی شاعری کہا جاتا اور ان میں درباری کی سیاسی چالیں شامل تھیں، جس کا اثر یہ ہوا کہ اس زمانے کے عالم اور فاضل افراد بھی غالبؔ کی مشکل گوئی کا مذاق اڑانا جائز سمجھتے تھے، چنانچہ اس سے بڑھ کر کیا کفرانِ سخن ہو کہ کسی فاضل سن رسیدہ دوست نے غالبؔ کے سامنے مہمل مصرعوں کو موزوں کر کے ان کے دیوان سے بتایا کر اس کا مذاق اڑانا چاہا۔ وہ شعر یہ ہے:

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

اسی دور کے کسی نامور شاعر نے غالبؔ پر طنز یہ لکھا :

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالبؔ آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

ذوقؔ کے دوست اور دربار، شاہی سے وابستہ حکیم آغا جان عیشؔ نے بھی بھری محفل میں غالبؔ کی ادق بیانی کا مذاق اڑایا۔ یہاں زبانِ مرزا سے مراد میرزا سوداؔ اور ان کے قصیدوں کا تتبع کرنے والے ذوقؔ ہیں :

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھے یا خدا سمجھے

یہ طنز و مزاح کے سامان بیشتر ذوقؔ کے حامیوں کی جانب سے غالبؔ کے لئے فراہم کیے جاتے تھے اور بعض اوقات خود حضرت ذوقؔ محرمانہ مسائل چھیڑ دیتے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ''لطائفِ شعرا'' میں مفتی انتظام اللہ نے لکھا ہے کہ ذوقؔ نے شہزادہ عالی کو مخاطب کر کے ایک نجی محفل میں یہ مقطع پڑھا، جس کو بعد میں محفل کے ایک شخص نے غالبؔ تک پہنچادیا :

سمجھ ہی میں آتی ہے کوئی بات ذوقؔ اس کی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

بات صرف یہاں تک نہیں رکی بلکہ اس دور کے مزاح گو شاعر عبدالرحمان، جو ہدہدؔ تخلص کرتے تھے اور جن کو بہادر شاہ ظفرؔ نے طائر الاراکین، شہپر الملک، ہدہد الشعرا، منقار جنگ بہادر کے خطابات عطا ہوئے اور ماہانہ سات روپے مقرری دی گئی، انھوں نے بھی لوگوں کو ہنسانے کے لئے غالبؔ کے انداز پر مطلع کہا :

مرکز محور گردوں پہ لب آب نہیں
ناخن قوس و قزح شبہ مضراب نہیں

غالبؔ اس غم کو غلط کرنے اور کبھی لوگوں کو سمجھانے کے لئے کہہ دیتے :

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپاہ گری
کچھ شاعری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے

اور کبھی ذوقؔ پر یوں چوٹ کس دیتے :

بنا ہے شہ کا مصاحب ، پھرا ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

غالبیات سے واقف حضرات یہ جانتے ہیں کہ غالبؔ، میر تقی میرؔ کا بڑا احترام کرتے اور ان کے کلام کو صحیفِ

شاعری سمجھتے تھے :

غالبؔ! اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

لیکن ذوقؔ میر کی زمینوں میں غالبؔ کی کوشش کو سعیِ بیہودہ سمجھتے تھے کیونکہ خود بری طرح اس تجربہ میں ناکام ہو چکے تھے، اسی لئے غالبؔ پر طنز کیا تھا :

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ ! یاروں نے بڑا زور غزل میں مارا

جب دربار میں غالبؔ نے شاہ ظفر کے سامنے یہ مقطع پڑھا :

یہ مسائلِ تصوف ، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تو فوراً بہادر شاہ ظفر نے مسکرا کر کہا: اس وقت بھی ہم ایسا نہیں سمجھتے۔ اگرچہ محفل میں غالبؔ نے اس بات پر بات بنا کر اچھی طرح نبھایا اور پھر اپنے دعویٰ کا اظہار کیا لیکن بہر حال ذوقؔ نے غزل کے مقطع میں غالبؔ پر نیش زنی کی:

اے ذوقؔ ! بس نہ آپ کو صوفی جتایئے
معلوم ہے حقیقت ہُو حق جناب کی

پروفیسر احتشام حسین نے ان اشعار کی چوٹ غالبؔ پر بتائی ہے۔

1850ء میں جب بہادر شاہ ظفر کے مرشد کالے شاہ صاحب کی سفارش سے غالبؔ کی شاہی دربار میں رفت و آمد شروع ہوگئی انھیں تاریخ شاہانِ تیموری ''مہرِ نیمروز'' لکھنے کا موقع ملا اور ولی عہد شہزادہ فتح الملک کے استاد ہوئے تو ذوقؔ اور ان کے احباب کے حلقہ کو ناگوار گزرا کیونکہ بقول مؤلفِ ''غالب'' شیخ محمد اکرام: ذوقؔ اور ان کے معاونین مرزا کی کوششوں میں روڑے اٹکاتے تھے اور شاہی دربار میں غالبؔ کی رسائی کے حق میں نہیں تھے۔ دربار میں لوگ بادشاہ کا دل ان کی طرف سے مکدّر کیے ہوئے تھے۔ بہر حال، انھی دنوں، یعنی دسمبر **1851**ء میں مشہور ''سہرا'' کا واقعہ پیش آیا جب بہادر شاہ ظفر کی ملکہ زینت محل نے غالبؔ سے مرزا جوان بخت کی شادی پر سہرا لکھنے کی فرمائش کی تو غالبؔ نے **12** شعر کا خوبصورت سہرا لکھا اور اس کے مقطع میں تعلّی اور طنز سے کام لیا :

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

دربار اور قلعہ میں اس مقطع پر چوٹ اور چیلنج تصور کیا گیا، چنانچہ بہادر شاہ ظفرؔ نے استاد ذوقؔ سے کہا: مقطع پر نظر رکھتے ہوئے تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ ذوقؔ نے پندرہ اشعار کا سہرا لکھا اور مقطع میں غالبؔ کا جواب یوں دیا:

جس کو دعویٰ ہے سخن کا، یہ سنا دے اس کو
دیکھ! اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

دلّی کے گلی کوچوں میں دونوں سہروں کے شعر زبان زدِ عام ہوگئے۔ یہاں غالبؔ کا مقابلہ ظاہری طور پر ذوقؔ سے تھا لیکن پشت پر دہ بہادر شاہ ظفرؔ تھے۔ عام لوگ اس کو غالبؔ کی زیادتی سمجھ رہے تھے چنانچہ حالات کو سازگار بنانے کے لئے غالبؔ نے بارہ شعر کا ایک قطعہ لکھا جس میں اپنی بات چیت کو کنایہ، رمز، ایما اور اشارے مین پیش کیا۔ عام قاری کے ذہن اس قطعہ کو غالبؔ کا معذرت نامہ خیال کرنے لگے لیکن بقولِ احتشام حسین ''یہ قطعہ غالبؔ کی قادر الکلامی، ذہانت اور معاملہ فہمی کا نادر نمونہ ہے۔ اس کا ہر شعر معنونیت کا خزانہ اور ندرتِ ادا کا معجزہ ہے۔ یہ ایک نازک ترین مقام تھا جس میں خودداری اور مصلحت کی جنگ تھی اور غالب اس سے بڑی خوبی سے عہدہ برآ ہوئے۔ اس قطعہ کے چند اشعار یہ ہیں :

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب ، یہ مجال ، یہ طاقت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں ، جنوں نہیں ، وحشت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ ! خدا گواہ
کہتا ہوں کہ سچ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

واقعات یہ بتاتے ہیں کہ ذوقؔ اور غالبؔ میں کدورت بڑھتی گئی اور اکثر محافل اور مشاعروں میں دونوں کو

ایک مقام پر نہیں دیکھا گیا۔ غالبؔ اگرچہ دربار میں آیا جایا کرتے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ بہادر شاہ ظفرؔ ذوقؔ کے حامی ہیں۔ غالبؔ کو تمام عمر دلی کے دربار اور اس کے ماحول کے شعری مذاق سے گلہ رہا۔ غالبؔ نے ایک قصیدہ، جو بہادر شاہ ظفرؔ کے لئے لکھا تھا، اس میں ہلکے اشارے ذوقؔ پر نظر آتے ہیں۔ وہ یہ ہیں:

نے ہے ترانہ سنج نکسیا نوا بود
نے ہر سخن سرائے بہ سحباںؔ برابرست
نے ہر شتر سوار بہ صالح بود ہماں
نے ہر شباں بہ موسیٰؑ عمراں برابرست
نے ہر گنج یافت ز پرویز گوئی بود
نے ہر کہ باغ ساخت برضواں برابرست

(ترجمہ: ہر نغمہ نگار نکسیا نہیں اور ہر شاعر سحبانؔ کے برابر نہیں۔ ہر خزانہ دار پرویز نہیں اور ہر باغ، جو بنایا جائے، باغِ فردوس نہیں بن سکتا)۔

ان اشعار میں غالبؔ یہ بیان کرنا چاہتے تھے کہ میرے سمندِ تخیل کو دوسری سواریوں کے ساتھ ایک اصطبل میں نہ باندھا جائے، کیونکہ :

ع۔ کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے انداز بیاں اور

غالبؔ غزل پر غالب ہوتے ہوئے بھی میرؔ سے مغلوب کیوں؟

میرؔ، آتشؔ، ناسخؔ، غالبؔ، اور آبادؔ کی ایک بحر میں ہم قافیہ ردیف غزلوں کا ریویو

ہمارے دور کے مشہور تنقید نگار پروفیسر آل احمد سرورؔ نے اپنے دو شعروں میں غزل کے فن پر بڑے پتہ کی بات کہی ہے :

غزل میں ذات بھی ہے اور کائنات بھی ہے
ہماری بات بھی ہے اور تمہاری بات بھی ہے
سرورؔ! اس کے اشارے داستانوں پر بھی بھاری ہیں
غزل میں جوہر ارباب فن کی آزمائش ہے

غزل جیسی صنفِ سخن، جس کو سخن کا سرتاج بھی کہا جا سکتا ہے، جاذبہ اور دافعہ کی حامل رہی ہے۔ بعض شعرا نے اسے غمِ جاناں اور غمِ دوراں جان کر کبھی دل سے دور نہیں کیا جنھیں یک فنا کہا گیا۔ البتہ غزل گو شعرا کی فہرست طولانی ہے اور بقول فراقؔ گورکھپوری کے تقریباً پچاس معروف غزل گو شعرا اُردو کے گیسوئے غزل کو سنوارتے رہے ہیں، لیکن ولیؔ، میرؔ، سوداؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، ناسخؔ، غالبؔ، جرأتؔ، مومنؔ، ذوقؔ، آبادؔ، مجروحؔ، امیرؔ، داغؔ، عزیزؔ، اکبرؔ، شادؔ، حسرتؔ، فانیؔ، اقبالؔ، یگانہؔ، اصغرؔ، جگرؔ، سیمابؔ، اثرؔ، اور کئی دیگر قابلِ ذکر ہیں۔ دوسری طرف اس کی ساخت، ذات اور ہیئت پر اعتراض کرنے والوں میں وحید الدین سلیم نے کہا کہ غزل کا شاعر قافیہ کا غلام ہوتا ہے۔ وہ خیال کے مطابق قافیہ نہیں لاتا بلکہ قافیہ کے مطابق خیال ڈھونڈتا ہے۔ عظمت اللہ خان نے فتویٰ دیا کہ اُردو شاعری کی ترقی کے لئے غزل کی گردن بے تکلف ماردی جائے۔ کلیم الدین احمد نے غزل کو ''نیم وحشیانہ شاعری'' کہا۔ جوشؔ ملیح آبادی نے اس کو اظہارِ بیان کی پابندی کہی اور یہ درس پہلے انھوں نے نظم طباطبائی سے سیکھا۔ حالیؔ نے اس کو بے وقت کی راگنی کہا۔ اگرچہ حالیؔ غزل کے مخالف نہ تھے لیکن غزل میں معاملہ بندی اور اس میں داخل خارجی معاملات کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ میر تقی میرؔ غزل میں روا بعض شعرا کی ''چوما چاٹی'' سے بیزار اور حضرت غالبؔ کو ''تنگنائے غزل'' ناکافی معلوم ہوئی۔ ان تمام مسائل کو رکھتے ہوئے بھی غزل چونکہ رمز و کنایہ، تشبیہات واستعارات، واردات خارجی وداخلی سے لبریز تھی، اس لئے ہر زمان اور مکان میں گلشنِ شاعری کا گلِ

سر سبد بنی رہی، کیوں کہ غزل میں کہی گئی داستان بقولِ سیماب: ع۔ جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے۔

ہم نے اس مضمون میں غالبؔ کی مشہور غزل: ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا'' کو منتخب کر کے اسی بحر، ردیف اور قافیہ میں کہی گئی چار متقدمین کی غزلوں سے مقایسہ کیا ہے جو ادب کے طالب علموں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ غالبؔ کی اس غزل میں، جو ان کے دیوان کی سب سے پہلی غزل قرار دی گئی ہے، صرف پانچ اشعار ہیں جن کے چھ مصرعوں میں قافیے تحریر، تصویر، شیر، شمشیر، تقریر اور زنجیر باندھے گئے ہیں۔ غالبؔ کے متقدمین میں اس بحر، ردیف اور قافیے میں ہمیں میرؔ، آتشؔ، ناسخؔ، اور مرزا مہدی خان آبادؔ کی غزلیں نظر آتی ہیں۔ اُردو کے دیگر عظیم شعرا سوداؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، مومنؔ، ذوقؔ، اور اقبالؔ کے دواوین میں اسی بحر میں ہم ردیف و قافیہ غزلیں موجود نہیں۔

ایک ہی بحر میں ہم قافیہ اور ردیف اشعار کا مقایسہ اس لئے دلچسپ ہے کہ مختلف عظیم شعرا کی قوتِ تخیّل اور فنِ تغزل کو کسی حد تک ایک ہی معیار پر تولا جا سکے۔ یہاں یہ اشکال بھی ہے کہ یہ غزلیں مختلف ادوار کی پیداوار ہیں اور متاخرین کے سامنے متقدمین کی غزلیں موجود تھیں، یعنی غالبؔ کے سامنے میرؔ کی غزل کے ۱۳ شعر، آتشؔ کے ۲۲ شعر، ناسخؔ کے ۲۴ شعر اور آبادؔ کے ۲۴ شعر موجود تھے۔ ایک ہی بحر میں ہم ردیف و قافیہ (۸۳) اشعار کا ہونا رحمت بھی ہے اور زحمت بھی ہے۔ رحمت، سمندِ تخیّل کو مہمیز کرنے کے لئے اور زحمت، توارد اور سرقہ کے الزام سے بری ہونے کے لئے۔ اس مضمون میں ہم نے مقایسہ کے لئے ان عظیم شعرا کے وہی اشعار نقل کئے ہیں جو غالبؔ کے قافیوں کے ہم قافیہ ہوں۔ اس مضمون میں ہم نے کسی بھی شعر کے محاسن پر بحث نہیں کی کیونکہ وہ سعد بن لندھور کی داستان ہو جاتی۔ شعر کا انتخاب ہمارا ذاتی فیصلہ ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔

ع۔ عقلِ معقول بفرمائگلِ بے خار کجاست۔

غالبؔ کا مطلع : نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

''تحریر'' اور ''تصویر'' قافیوں پر میرؔ کی غزل میں ''تصویر'' پر صرف ایک شعر، خواجہ آتشؔ کی غزل میں ''تحریر'' پر ایک اور ''تصویر'' پر پانچ شعر، ناسخؔ کی غزل میں صرف ''تصویر'' پر آٹھ شعر اور آبادؔ کی غزل میں صرف ''تصویر'' پر تین شعر اس طرح ہیں :

میر تقی میرؔ: سب کھلا باغ جہاں الاّ یہ حیران و خفا
جس کو دل سمجھے تھے ہم، سو غنچہ تھا تصویر کا

خواجہ آتشؔ (۱) حال مستقبل بخوبی اس سے کرتے ہیں بیاں
زایچہ بھی نقل ہے پیشانی کی تحریر کا

(۲) رتبہ سونچا ہے خموشی سے یہ مجھ دلگیر کا
جو کوئی دیکھے اسے شک ہو گُل تصویر کا

(۳) دے سکا بوسہ نہ اک وہ برق وش خیراتِ حسن
مالدار بے کرم بھی ابر ہے تصویر کا

(۴) کیسی کیسی صورتوں کے دل میں اپنے داغ ہیں
اس مرقع میں بھی ہے کیا کیا ورق تصویر کا

(۵) چاک ہوتا ہے کتاں مرے گریباں کی طرح
یہ بھی دیوانہ ہے آتشؔ! چاندسی تصویر کا

(۶) عالم منطق مصوّر ہے تیری تصویر کا
منہ کتاب ''قطبی'' ہے خط حاشیہ ہے ''میر'' کا

امام بخش ناسخ (۱) سایہ گلبن پر اگر پڑ جائے مجھ دلگیر کا
ہو ہر ایک غنچہ میں عالم غنچۂ تصویر کا

(۲) لاغر ایسا ہوں کہ میں اکثر ہوا سے اوڑھ گیا
میرے پیکر میں ہے عالم کاغذ تصویر کا

(۳) شکل اُس کی ایسی ہے دلچسپ، گر پڑ جائے عکس
تا قیامت آئینہ میں شبہ ہو تصویر کا

(۴) وہ تصور پیشہ ہوں گر ہو میری تربت پہ نخل
ہو ورق ہر برگ کی جا یار کی تصویر کا

(۵) کون عالم کے مرقع میں سجا لے گا ثبات
رنگ اوڑ جاتا ہے کھنچتے ہی مری تصویر کا

(۶) اے مصوّر ! سوزِ غم کی بھی رعایت چاہیے
خاک گلخن سے بنا گڑ وہ میری تصویر کا

(۷) میری قسمت میں ہے بربادی عجب کیا ہے اگر
کاغذ بادی بنے کاغذ میری تصویر کا

(۸) لاغر ایسا ہوں کسی کو میں نظر آتا نہیں
چاہیے مانی ورق سادہ میری تصویر کا

مرزا مہدی آبادؔ (۱) دھیان ہے ہر دم مجھے اس چاند سی تصویر کا
سامنا ہے روز برقِ طور کی تنویر کا

(۲) چپ ہوا ہوں دیکھ کہ نقشہ بتِ بے پیر کا
منہ میرا گویا دہن ہے بلبل تصویر کا

(۳) چاند جس کا رکھ دیا ہے نام سب نے متفق
آسماں پر ہے یہ اک خاکہ تری تصویر کا

ردیف غزل کے پاؤں میں پائل کا حکم رکھتی ہے۔ ردیف سے غزل کے نغمہ اور آہنگ میں اضافہ ہوتا ہے۔ فارسی اور اُردو علمانے بڑے شاعر کے کمال پر بحث کرتے ہوئے ایک خاص نکتہ یہ پیش کیا ہے کہ بڑے شاعر کی نظر غزل کے قافیے پر نہیں بلکہ ردیف، وہ بھی ردیف کی **Joint** چولوں پر ہوتی ہے جو قافیہ کی چولوں کو **Joint** میں بٹھائی جاتی ہے۔ بڑا شاعر قافیہ کو ردیف میں ایسا کھپا دیتا ہے کہ ساخت اور معنی کے اعتبار سے ردیف کوئی اضافی چیز معلوم نہیں ہوتی۔ ہمارے اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے میرؔ کا ایک شعر ردیف ''گیا'' میں پیش کیا جاتا ہے جس میں قافیہ ردیف میں گم ہو گیا اور ردیف سے پورے شعر کی شعریت حاصل ہوئی۔

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

بہر حال، خواجہ آتشؔ کے پاس شعر نمبر تین اور پانچ، ناسخؔ کے پاس شعر نمبر دو، پانچ اور سات اور آبادؔ کے شعر نمبر دو متوسط درجہ کے غزل کے شعر محسوب ہو سکتے ہیں اور باقی تمام اشعار، جن میں تری، مری تصویر کا غلبہ ہے، درحقیقت معاملہ بندی اور خارجی خیالات کے معمولی خیالات ہیں۔

میؔر کا شعر ان تمام اشعار سے الگ اور عمدہ ہے جس میں میؔر کا انداز ٹپک رہا ہے، پھر بھی غالبؔ کا مطلع طالع اور تابناک ہے جسکی روشنی نے میؔر کے شعر کو بھی مدھم بنا دیا۔ ناسخؔ کے مصرع: ع۔ ''میرے پیکر میں ہے عالم کاغذ تصویر کا......اور......ع۔ کاغذِ بادی بنے کاغذ میری تصویر کا'' غالبؔ کے شعر کی تخلیق کے وقت پیش نظر ضرور رہے ہوں گے اور غالبؔ کو میؔر کی نسبت سہولت حاصل رہی ہوگی۔ امام بخش ناسخؔ متولد ۱۷۷۲ء غالبؔ متولد ۱۷۹۷ء سے عمر میں ۲۲ سال بڑے تھے۔ ناسخؔ اور غالبؔ میں نہ صرف خط و کتابت کا رشتہ قائم تھا بلکہ غالبؔ نے ناسخؔ کو اپنا منتخب اُردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ ۱۶ ربیع الاول ۱۲۵۰ ہجری کو ارسال کیا اور ناسخؔ نے بھی اپنا ایک قلمی نسخہ غالبؔ کو روانہ کیا تھا جو یقیناً غالبؔ کے مطالعہ میں رہا ہوگا۔ آتشؔ، ناسخؔ اور غالبؔ نہ صرف میؔر کی استادی کو قبول کرتے تھے بلکہ اس کی تقلید اور پیروی کو اپنی معراج تصور کرتے تھے اور گاہے گاہے میؔر کے تقدس کے گن گاتے تھے۔ اسی لئے آتشؔ نے کہا۔ ع۔ منہ کتاب ''قطبی'' ہے خط حاشیہ ہے ''میؔر'' کا

ناسخؔ نے کہا:

شبہ ناسخؔ نہیں کچھ میؔر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میؔر نہیں

اور غالبؔ نے اس کی تائید کی:

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میؔر نہیں

غالبؔ کی غزل کا دوسرا شعر:

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اگرچہ تنہائی کا عشقیہ شاعری میں گھسا پٹا فرسودہ مضمون ہمیشہ نظر آتا ہے جس کو غالبؔ نے نئی زندگی عطا کی اور اس قافیے ''شیر'' میں آتشؔ کے دو اور ناسخؔ کا صرف ایک شعر ملتا ہے:

خواجہ آتشؔ — مثلِ شانہ دست رس اُس زلف پر ہوئے اگر
دعوت افعی کروں بھر کر پیالہ شیر کا

(۲) خود بیاں رخ کی صباحت کا کرائے شیریں دہن
قند کے کوزے سے جاری ہووے دریا شیر کا

امام بخش ناسخ ہے دلیلِ مرگِ انسان واقعی موئے سفید
کوہکن کی موت تھی انجام جوی شیر کا

بہر حال، ان تینوں اشعار کے مضامین میں جدّت کم اور قافیہ پیمائی کی مشق زیادہ نظر آتی ہے۔ اسیرؔ لکھنوی کی بابت مشہور ہے کہ ہر قسم کے قافیے استعمال کرتے تھے۔ اسیرؔ تو قافیے کے اسیرؔ مشہور ہو گئے لیکن ذوقؔ کو کیا کہیں کہ ایک قصیدہ میں ۶۲ قافیوں کو ایسا پیٹا کہ ان کی نکسیر بھی نہ پھوٹی۔ غالبؔ کا یہ شعر چونکہ جدید پیرا ہن پہن کر وارد ہوا تو مورد قبول اور نیا سمجھا گیا اور ممتاز رہا۔ غالبؔ کا تیسرا شعر سراپا اچھوتا اور آمد ہی آمد ہے :

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا

اس قافیے "شمشیر" کے ذیل آتشؔ کے چار، ناسخؔ کے تین اور آبادؔ کے چھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ میرؔ کا بھی شعر اس قافیہ میں یوں ہے :

کیوں کہ نقاش ازل نے نقش ابرو کا کیا
کام ہے ایک تیرے منہ پر کھنچا خط شمشیر کا

خواجہ آتشؔ (۱) ہجر کے صدمے سے خوبی عشق کی ظاہر ہوئی
زخم کی ایذا سے جوہر کھل گیا شمشیر کا

(۲) نوش بے صرفہ کرے خون گنہگارانِ عشق
پھول سے رنگیں رہے پھلوا تیری شمشیر کا

(۳) روسیہ دشمن کا یوں پابوس سے کھینچے فگار
جیسے سہلٹ کی سپر پر زخم ہو شمشیر کا

(۴) روک منہ پر وار قاتل کے سپر کی طرح سے
مرد کے چہرے کا زیور زخم ہے شمشیر کا

ناسخ(۱) ناتوانوں سے پناہ ، اے ظالمو! مانگا کرو
دیکھ لو اک بال ہے بازو شکن شمشیر کا

(۲) کیا ہے کبر مدعی میری تواضع کے حضور
سرکشی دم میں مٹا دیتا ہے خم شمشیر کا

(۳) دوستوں کے سر کیے چن چن کے مقتل میں قلم
چشمِ بینا ہے ہر اک جوہر تری شمشیر کا

آباد(۱) خون ایسا گرم ہے مجھ عاشقِ دلگیر کا
بن گیا رشک شرر جوہر تری شمشیر کا

(۲) وار کیا کیا تُو نے ، اے قاتل! لگائے واہ واہ!
مان جائیں کیوں نہ ہم لوہا تری شمشیر کا

(۳) تشنۂ شوقِ شہادت کب سے ہوں سیراب کر!
مجھ کو پانی چاہیے قاتل تری شمشیر کا

(۴) مضطرب میرے تڑپنے نے اسے بھی کر دیا
دیدۂ بسمل بنا جوہر تری شمشیر کا

(۵) عشق ابرو جائے گا کیا مرے دم کے ساتھ ہی
مرگ ہے قبضے سے چھٹنا مرد کے شمشیر کا

خواجہ آتش کا شعر نمبر ۴ ناسخ کا شعر نمبر تین اور آباد کے شعر نمبر ۳، ۴، ۵، خوبصورت اور عمدہ اشعار ہیں۔ ''شمشیر'' کے قافیے پر اُردو شاعری اور خصوصی طور پر مرثیوں میں صدہا ایسے اشعار ہیں کہ کوئی بھی مضمون، جو شمشیر کی خصوصیت سے منسلک ہو، اس کینوس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ اس کے باوجود حسنِ تعلیل، ایہام، تجنیس اور تلمیحات سے نئے مضمون تراشنا غزل گو شعرا کا ہنر سمجھا جاتا ہے۔ میر کے شعر میں غضب کی جمالیاتی مصوری پوشیدہ ہے لیکن پھر بھی غالب کا شعر لاجواب ہے۔ فارسی اور اُردو ادب میں اس مضمون اور اس پائے کا شاہکار شعر شاید ہی تخلیق ہوا ہو۔ ''جذبۂ بے اختیار شوق'' غالب کا انداز ہے۔ ''سینۂ شمشیر'' اور ''دمِ شمشیر'' اس شعر کے پیکر کی ساخت کی معجز بیانی ہے۔ اسی لئے تو ابوالکلام آزاد نے سچ کہا تھا کہ ''میر انیس کے مراثی اور غالب کی غزلیات اُردو ادب کی جانب سے دنیائے ادب کو تحفہ تصور کئے جائیں۔''

غالب کی غزل کا چوتھا شعر:

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اس طرز میں آتش کے پاس ایک اور آباد کے پاس دو اشعار ملتے ہیں:

آتش (۱) رتبۂ موسیٰ نماز پنجگانہ نے دیا
پانچ وقت اللہ سے موقع رہا تقریر کا

آباد (۱) سب کرشمے بھول جائیں گر سنیں ترا بیان
ساحروں پر سحر چل جائے تری تقریر کا

(۲) جو تری صحبت میں بیٹھا آن کر گلچیں ہوا
پھول جھڑتے ہیں یہ عالم ہے تری تقریر کا

خواجہ آتش کا شعر ان کی فکر تصوف اور ''فنا فی اللہ'' فلسفہ کی گونج ہے۔ یہ خوبصورت اور مقبول شعر ہے۔ آباد کے دونوں شعر حسن وعشق کی نوک جھونک اور لکھنوی تہذیب کی آوازِ بازگشت معلوم ہوتے ہوئے بھی غالب کے شعر کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتے اور اسی لئے ان اشعار کا مقایسہ شریعت ادب میں مکروہ ہوگا۔

غالب کی غزل کا مقطع :

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

''زنجیر کے قافیے پر میر کا ایک شعر آتش کے دو شعر اور ناسخ کے چھ شعر پیش کئے جاتے ہیں :

میر (۱) نالہ کش ہیں عہدِ پیری میں بھی تیرے در پہ ہم
قد خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا

خواجہ آتش (۱) جس سے لپٹا، سوکھا مجنوں کی طرح سے وہ درخت
عشق پیچے پر مجھے ہوتا ہے شک زنجیر کا

(۲) غش کریں گے کودکاں، وحشت سے مجھ دیوانے کی
حلق بسمل ہے ہر اک حلقہ مری زنجیر کا

ناسخ(۱) وحشت دل ہوں میں دیوانہ تری تاثیر کا
چشم آہو بن گیا حلقہ ہر اک زنجیر کا

(۲) برسوں گزریں ہیں صدا باہر نکل سکتی نہیں
ہے ہمارا ضعف درباں خانۂ زنجیر کا

(۳) بن گیا بت جو لگا عشق بتاں میں مجکو سنگ
نالۂ ناقوس ہر نالہ ہوا زنجیر کا

(۴) گلشن کوی بتاں کا ہے جو زنداں میں خیال
نغمۂ بلبل ہے ہر نالہ مری زنجیر کا

(۵) اس خرابے میں بنایا جس نے گھر دیوانہ ہے
دیکھ ہر دروازے پر ناسخ نشاں زنجیر کا

آتش کا شعر نمبر ۲ اور ناسخ کے شعر نمبر ۳، ۴، ۵ عمدہ غزل کے شعر سمجھے جاتے ہیں۔ ناسخ کے اشعار میں زنجیر کی صدا جھنکار کو حلقِ بسمل، نالۂ ناقوس اور نغمۂ بلبل کی آواز سے مصرع ثانی میں ظاہر کیا گیا ہے اور مجبوری اور محصوری کو حلقہ سے تعبیر کیا گیا ہے، جب کہ میر :

نالہ کش ہیں عہدِ پیری میں بھی تیرے در پہ ہم
قد خم گشتہ ہمارا حلقہ ہے زنجیر کا

پہلے مصرع میں ''نالہ کش'' سے زنجیر کی جھنکار مراد ہے۔ اور ''قد خم گشتہ'' کی تشبیہ حلقۂ زنجیر سے دینا میر صاحب ہی کا حق ہے۔

میر کی آواز میں وہ تہیں ہیں، وہ خاموش گہرائیاں سموئی ہوئی ہیں، وہ ہمہ گیر اور دور رسی ہے وہ وزن ہے جو

دوسروں میں نہیں۔ اس میں ہستی کے ساتھ ساتھ بستی کا ذکر ہے :

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد دل لاکھوں کیے جمع تو دیوان ہوا

اسی لئے تو ان کے ہم عصر رفیع سوداؔ نے بھی میرؔ کی کہی غزلوں کی زمینوں پر غزلیں کہنا فخر جانا :

سوداؔ ! تُو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف

مصحفیؔ نے ایک شعر پر میر کی داد حاصل کی تو اس کا ذکر اپنے دیوان میں کیا :

اکبر نے شاعری کا اکبر اعظم میرؔ ہی کو جانا :

میں ہوں کیا چیز کہ اس طرز پہ جاؤں اکبرؔ
ناسخؔ و ذوقؔ بھی جب چل نہ سکے میرؔ کے ساتھ

اور حسرتؔ نے اپنے دل کی حسرت یوں بیان کی :

شعر مرے بھی ہیں پُردرد و لیکن حسرتؔ
میرؔ کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں

یہی میرؔ کا شیوۂ گفتار لذتِ گفتار اور طرزِ گفتار ہے جو میرؔ کا انداز ہے، جس پر ابھی ناقدین، محققین اور شعرا کو بہت کچھ کرنا ہے :

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس! تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

☆......☆......☆

غالب کے اشعار کے معنی خود غالب سے پوچھیے؟

یہ بھی زمانے کی ستم ظریفی تھی کہ عوام نے غالبؔ کی زندگی میں ان کے کلام کے مقام و مرتبہ کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔لوگوں نے نہ صرف ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا بلکہ ان کے کلام کا مذاق بھی اڑایا۔ مشہور ہے کہ غالبؔ کے ایک آشنا عبدالقادر رامپوری نے جن کا لال قلعہ سے بھی تعلق تھا، ایک دن غالبؔ سے کہا: آپ کا یہ شعر سمجھ میں نہیں آتا:

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا غالبؔ نے یہ سن کر کہا کہ یہ شعر میرا نہیں لیکن عبدالقادر نے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ میں نے آپ ہی کے دیوان میں دیکھا ہے۔یعنی وہ طنز کر کے یہ بتانا چاہتے تھے کہ غالبؔ کا دیوان ایسے مہمل اشعار سے بھرا پڑا ہے۔اسی لئے تو غالبؔ نے نواب علاؤالدین احمد کو لکھا: ''مجھے اپنے ایمان کی قسم! میں نے اپنی نظم ونثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا''۔یہ حقیقت ہے کہ غالبؔ کے کلام کا موضوع فلسفہ ہے اور ان کی شاعری کے بدن پر الفاظ کا جامہ اتنا باریک اور تنگ ہے کہ صاحبِ نظر کو اس کا عریاں بدن نظر آسکا ہے لیکن اسے دیکھنے کی تاب ہر شخص میں نہیں۔بعض نقاد اسے کیفِ شراب، یعنی نشہ کا حاصل سے موسوم کرتے ہیں جو غالبؔ سے زیادتی ہے، جب کہ یہ انتہائی بلند فکری ہے۔اسی لئے تو خود غالبؔ نے کہا تھا :

مشکل ہے ز بس کلام میرا ، اے دل!
سن سن کے اُسے سخن وران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

کبھی غالبؔ نے اپنے دل کو یوں بھی تسلی دی:

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی ، نہ سہی

اور کبھی یہ سوچ کر خوش ہو گئے :

ع۔خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

غالبؔ عبدالقادر شاکر کو خط میں لکھتے ہیں: ''نظم ونثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا وتوانا کی عنایت واعانت سے خوب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام ونشان باقی رہے گا۔''

اسی لئے تو غالبؔ کا کلام ہندوستان کی الہامی کتاب بن گیا اور بجنوری کو کہنا پڑا: ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: مقدس وید اور دیوانِ غالبؔ۔ اردو ادب میں کئی مستند شرحیں غالبؔ کے کلام پر لکھی گئیں۔ شارحین نے ان کے تقریباً سارے اردو دیوان پر تنقید وتبصرہ کیا ہے جو بڑی حد تک غالبؔ کے اشعار کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ غالبؔ نے خود اپنے خطوط میں بعض اشعار کے معنی بتائے ہیں جن کو اس مضمون میں پیش کیا جارہا ہے۔

غالبؔ کے اردو دیوان کی پہلی غزل کا پہلا شعر :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کو بعض ناقدوں نے کیف شراب کا ماحصل سمجھ کر بے معنی قرار دیا جو غالبؔ کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس شعر میں اگر کاغذی پیرہن کو سمجھا جائے تو شعر سمجھ میں آسکتا ہے۔ غالبؔ نے عبدالرزاق شاکر کو لکھا: ''ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کسی کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے، اس کا پیرہن کاغذی ہے، یعنی ہستی اگرچہ مثلِ تصاویر اعتبارِ محض ہو، موجب رنج وملال وآزار ہے۔''

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا
قیس، تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

کے بارے میں عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں: '' رقیب بہ معنی مخالف۔ شوق، سروسامان کا دشمن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قیس، جو زندگی میں ننگا پڑا پھرتا تھا، تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر بالتن عریاں ہی کھینچتی ہے، جہاں کھینچتی ہے۔''

اسی غزل کے دوسرے شعر:

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی ، یارب!
تیر بھی سینۂ بسمل سے پُر افشاں نکلا

کے متعلق لکھتے ہیں: یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے، جیسا کہ اس شعر میں ہے

نہیں ذریعہ راحت جراحت پیکاں   وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

یعنی زخم، تیر کی توہین، بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین، بہ سبب ایک طاق سے کھل جانے کے۔ زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی، یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ پُر افشاں بہ معنی بے تاب اور یہ لفظ تیر کے مناسب حال ہے۔ معنی یہ کہ تیر تنگی دل کی داد کیا دیتا، وہ تو خود ضیق مقام سے گھبرا کر پر افشاں اور سراسیمہ نکل گیا۔

سبزہ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا

یہ زمرد بھی حریفِ دم افعی نہ ہوا

کے بارے میں چودھری عبدالغفور کے خط میں لکھتے ہیں: ''قبولِ دعا، وقتِ طلوع منجملہ مضامینِ شعری ہے۔ جیسے کتان کا پرتوِ ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا۔''

ہر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوناب

حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

قصۂ حمزہ کے بارے میں نواب کلب علی خان کو لکھتے ہیں: ''داستانِ حمزہ قصۂ موضوع ہے۔ شاہ عباس ثانی کے عہد میں ایران کے صاحب طبعوں نے اس کو تالیف کیا ہے۔ ہندوستان میں امیر حمزہ کی داستان اس کو کہتے ہیں اور ایران میں ''رموزِ حمزہ'' اس کا نام ہے۔ دو سو کئی برس اس کی تالیف کو ہوئے۔ اب تک مشہور ہے اور ہمیشہ رہے گا۔''

عبدالجمیل جنوںؔ کو اس غزل کا مطلع:

قطرۂ مے بس کہ حیرت سے نفس پرور ہوا

خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

میں لکھتے ہیں: اس مطلع میں خیال ہے دقیق مگر کوہ کندن و کاہ بیرون آوردن، یعنی لطف زیادہ نہیں۔ قطرہ ٹپکنے میں بے اختیار ہے بقدر یک مژہ بر ہم ذوق ثبات و قرار ہے۔ حیرت ازالہ حرکت کرتی ہے۔ قطرۂ مے افراطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر برابر بوند بن جوت ہم کورہ گئیں تو پیالہ کا خط اس تاگے کے بن گیا جس میں موتی پروتے ہوں''۔

یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ سوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

اس شعر کی شرح غالبؔ نے ماسٹر پیارے لال کو اس طرح لکھی: ’’پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے، ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور اس کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کروگے، بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی اس کو الف صیقل کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے۔ مصرع:

چاک کرتا ہوں میں جب سے گریباں سمجھا

یعنی ابتدائی سنِ تمیز سے مشقِ جنون ہے۔ اب تک کمالِ فن حاصل نہیں ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا بس ایک لکیر صیقل جو ہے، سو ہے۔ چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاک جیب آثار جنوں میں سے ہے۔‘‘

شاکر کو لکھتے ہیں: ع۔

ایک شمع ہے دلیل سحر، سو خموش ہے

یہ خبر ہے۔ پہلا مصرع: ع۔

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے

یہ مبتدا ہے۔ شب غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ہے

ظلمت غلیظ، سحر ناپید، گویا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں! ایک دلیل صبح کی بود پر ہے، یعنی بجھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھا یا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ صبح ٹھہرایا جائے، وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ پس دیکھا جائے جس گھر میں علامت صبح مویدِ ظلمت ہوگی، وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

عبدالجمیل جنوںؔ کو شعر:

ملنا ترا اگر نہیں آسان تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

کے بارے میں لکھتے ہیں ’’اگر تیرا ملنا آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر، تیرا ملنا آسان نہیں، نہ سہی۔ نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں، یعنی جس سے تو چاہتا ہے،

مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو ہم نے سہل سمجھ لیا تھا مگر رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے۔"

حسن اور اس پہ حسنِ ظن ، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے اور کو آزمائے کیوں

جنوں کو لکھتے ہیں: "مولوی صاحب! کیا لطیف معنی ہیں۔ داد دینا حسن عارض اور حسن ظن، دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں، یعنی صورت اچھی ہے اور گمان اس کا صحیح ہے کبھی خطا نہیں کرتا اور یہ گمان اس کو بہ نسبت اپنے سے ہے کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں اور میرا تیرِ غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس، جب اس کو اپنے پر ایسا بھروسہ ہے تو رقیب کا امتحان کیوں کرے اس حسنِ ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی ورنہ یہاں معشوق نے مغالطہ کیا تھا کہ رقیب صادق نہیں، ہوس ناک آدمی تھا۔ اگر اس پر امتحان درمیان آتا تو حقیقت کھل جائے۔"

غالب نے اس غزل کے تینوں اشعار کی تشریح عبدالرزاق شاکر کے خط میں یوں لکھی :

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمن راحت خونِ گرم دہقاں ہے
غنچہ تاشگفتن ہا برگ عافیت معلوم
باوجود دل جوئی خواب گل پریشاں ہے
ہم سے رنج بے تابی کس طرح اٹھایا جائے
داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

مثلِ انجم انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ وسامان ہو۔ موجودیت لالہ کی منحصر نمایشِ داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجئے کہ پھول کا درخت یا غلّہ جو کچھ بویا جاتا ہے، دہقان کو جوتنے بونے، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت کار میں گرم ہوا ہے، وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالفِ راحت اور صورتِ رنج۔

غنچہ ناشگفتن: کلی جب نئی نکلے بہ صورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول بنے برگِ عافیت معلوم۔ یہاں معلوم بہ معنی معدوم ہے اور برگِ عافیت بہ معنی مایہ آرام۔

مصرع: برگ عیشی بہ گور خویش فرست...... برگ اور سروبرگ بہ معنی ساز وسامان ہے۔

خواب گل، شخصیت گل، باعتبار خموشی و برجاماندگی پریشانی ظاہر ہے، یعنی شگفتگی وہی پھولوں کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا

ہونا۔ غنچہ بہ صورت دل جمع ہے۔ باوصف جمعیت دل گل کو خواب پریشاں نصیب ہے۔'' ہم سے رنج بے تابی الخ
پشت دست۔ صورت عجز اور خس بدنداں وکاہ بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے۔ پس جس عالم میں کہ داغ نے پشتِ
دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو، ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو۔''

۳۰ جون ۱۸۶۴ء کو عمدا لجمیل جنوںؔ کو :

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم!
میرا سلام کہیو! اگر نامہ بر ملے

کی تشریح کرتے ہوئے غالبؔ نے فرمایا: ''یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے۔ یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہے مگر کہے کا کہ یہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے۔ ایک دوست عاشق کا، ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضا را عاشق کا گماں سچ ہوا۔ قاصد مکتوب الیہ کو دیکھ کو والہ و شیفتہ ہو گیا۔ کیا خط، کیسا جواب۔ دیوانہ بن، کپڑے پھاڑ، جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس واقعہ کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے۔ کس کے باطن کی کس کو کیا خبر۔ اے ندیم! تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن نامہ بر کہیں مل جائے تو اس کو میرا سلام کہو کہ کیوں صاحب! تم کیا کیا دعویٰ عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا۔''

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

جنوںؔ کو اس شعر کا مطلب یوں لکھتے ہیں: ''اس میں کوئی اشکال نہیں۔ جو لفظ ہیں، وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا۔ مبہم کہتا ہوں کہ کچھ کروں گا۔ خدا جانے شہر میں یا نواح شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ کر پردیس چلا جائے۔''

عبدالرزاق شاکرؔ کو شعر:

متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

کے بارے میں لکھتے ہیں: ''تقابل اور تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج، وجود و عدم۔ لفظ مقابل اسی مصرع میں بہ معنی مرجع ہے، جیسے حریف کہ بہ معنی دوست بھی مستعمل ہے۔ مفہوم شعر یہ کہ ہم

اور دوست از روئے خوے وعادت ضد ہم دگر ہیں۔ وہ میری روانی کو دیکھ کر رک گیا۔

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بُلائے نہ بنے

اس شعر کے بارے میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں: ''بھائی! مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا۔ اس میں دو استفہام آ پڑے ہیں کہ وہ بہ طریقۂ طعن وتعریض سے کیے گئے ہیں۔ موت کی راہ نہ دیکھوں۔ کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں گا کہ بن آئے نہ رہے کیونکہ موت کی شان میں سے یہ بات ہے، ایک دن آئے ہی گی۔ انتظار ضائع نہ جائے گا۔ تم کو چاہوں؟ کیا خوب! کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے، یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تم کو بلا سکے، گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ بن بلائے، بغیر آئے نہیں رہتی۔ تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ سکوں''

یہ اُردو ادب کی خوش نصیبی ہے کہ غالبؔ نے بعض اشعار کی تشریح کر کے ثابت کر دیا کہ ان کے اشعار تخیل کے آسمانوں پر پرواز کرتے ہیں۔ اردو ادب کے دوسرے عظیم شعرا یعنی میر تقی میرؔ، میر انیسؔ اور علامہ اقبالؔ کے یہاں ایک دو ایسی روایتیں ہیں لیکن دقیق تشریح نظر نہیں آتی۔

علامہ اقبالؔ نے مرزا غالبؔ کی شان میں بہت صحیح کہا ہے:

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے، پر مرغ تصور کی رسائی تا کجا

غالبؔ کے ان اشعار پر ابنِ شقیق کا قول صادق آتا ہے:

فـــإذَا قِيْـلَ أَطْـمـع الـنَّــاسَ طُـرًّا
وَإِذا رِيـمَ اعـجـز الـمُـعـجـزِيـنـاَ

یعنی جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں لیکن جب کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان بھی عاجز ہو جائیں۔

☆......☆......☆

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟

نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ مرزا اسد اللہ خان بہادر غالبؔ سے کون واقف نہیں۔ 1797ء میں آگرہ (اکبر آباد) میں پیدا ہوئے۔ 73 سال عمر پائی اور 1869ء میں دہلی میں دفن ہوئے۔ خاندانی نسب، افراسیاب بادشاہِ توران سے ملتا تھا، حسب مغلیہ تھا اور کسب صدیوں سے سپاہ گری تھا۔ خود فرماتے ہیں۔

غالبؔ از خاکِ پاک تورانیم
لاجرم در نسب فرہ مندیم

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ، شاعری، ذریعہ عزت نہیں، مجھے

آپ کے دادا، سمر قند سے شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آئے اور جاگیر و مقام حاصل کیا۔ آپ کے والد عبداللہ بیگ خان، دہلی میں طوائف الملوکی کے ہنگامے کے بعد پہلے لکھنو گئے اور نواب آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہوئے، پھر حیدر آباد دکن گئے اور نظام علی خان بہادر کی سرکار میں شامل ہوئے۔ چند سال بعد وطن لوٹے اور راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی اور کسی معرکے میں مارے گئے۔ اس وقت غالبؔ کی عمر پانچ سال تھی، چنانچہ شفیق چچا نصر اللہ بیگ خان نے سرپرستی کی، لیکن چار سال بعد وہ بھی رخصت ہو گئے۔ ابھی تک غالبؔ کی زندگی عیش و راحت میں گزر رہی تھی۔ چچا کے انتقال پر لاکھوں روپوں کی جائیداد اور جاگیر کے وارث ہوئے، لیکن زمنے کی نیرنگیوں نے اس وسیلے کو چھین لیا، چنانچہ معمولی گذارے پر گذر ہونے گی۔ 1827 میں کلکتہ پہنچ کر استغاثہ کیا اور دو سال بعد ناکام واپس ہوئے۔ اودھ کے بادشاہ واجد علی شاہ نے سالانہ 500 روپے کا وظیفہ مقرر کیا تھا، جو دو سال بعد سلطنت کے ختم ہونے پر ختم ہو گیا۔ دہلی کے شاہ ظفر نے سات سال تک معمولی مدد کی۔ آخر میں رامپور کے نواب نے ایک سو روپے کا ماہانہ مقرر کیا۔ قصہ مختصر، غالبؔ کو ملکِ سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے غریبی کی زندگی بسر کرنی پڑی۔ چونکہ طبیعت بلا کی شوخ تھی، ہر غم کو ہنس کر غلط کر دیتے۔ کبھی دل کو یہ کہہ کر بہلا لیا۔

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

اور کبھی شعر میں رازِ درون کو یوں بیرون کر دیا:

مے سے غرض نشاط ہے ، کس رو سیاہ کو
یک گونہ بے خودی ، مجھے دن رات چاہئے

نو دس برس کی عمر میں شاعری شروع کی۔ 13 برس کی عمر میں نواب الٰہی بخش کی بیٹی امراؤ بیگم، جن کی عمر 11 سال تھی، شادی کی، جو آخری عمر تک غالبؔ کے گلے کا ہار بنی رہی۔ چنانچہ غالبؔ اپنے شاگرد امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے مرنے پر کہتے ہیں: "اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم کہ اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔" غالبؔ کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے، لیکن سب ایک دو سال جی کر مر گئے۔ غالبؔ نے فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم آگرے کے ایک جگت ممتاز استاد محمد معظم سے حاصل کی۔ ایک ایرانی شخص عبد الصمد سے، جو دو سال غالبؔ کے ساتھ رہا، فارسی زبان، اصطلاحات اور محاورات سیکھے۔ مرزا غالبؔ نے پہلے اپنا تخلص اسدؔ رکھا جو نام کی نسبت اسد اللہ سے تھا، لیکن جب کسی مشاعرے میں یہ معلوم ہوا کہ ایک معمولی شاعر کا تخلص بھی اسدؔ ہے تو فوراً اسی دن 1828ء میں حضرت علیؑ کے لقب اسد اللہ غالب کی مناسبت سے تخلص غالبؔ اختیار کیا، کیوں کہ بقول محمد حسین آزادؔ، غالبؔ عوام الناس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔

غالبؔ کا اصلی جوہر انفرادیت تھا۔ وہ ایک منفرد شخصیت اور خصوصیت کے مالک تھے۔ جس زمانے میں ہر شخص اردو پر سر دھنتا تھا، اس وقت وہ فارسی کی قلمیں لگا رہے تھے۔ جس دور میں شعرا اپنے کو اردو شاعر کہتے ہوئے اتراتے تھے، غالبؔ اردو سے کتراتے اور فارسی نظم و نثر کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ جہاں لوگ درباری مدح و ثنا کو مایہ افتخار سمجھتے تھے، غالبؔ اسے سایہ ننگ و عار جانتے تھے۔ جہاں سلیس اور آسان لفظوں میں شعر کہنا صنعت سمجھا جاتا، وہاں غالبؔ ندرتِ خیال اور مشکل بیان کو ترجیح دیتے تھے۔ خود کہتے ہیں:

مشکل ہے ز بس کلام مرا اے دل!
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
"گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"

غالبؔ کے ہم عصر اردو پن پر سراہ رہے تھے، تو غالبؔ فارسی زدگی پر ناز کر رہے تھے۔ انفرادیت، لباس اور حلیے میں بھی ملحوظ رکھی۔ خود لکھتے ہیں۔" یہ یاد رکھیے، اس بھونڈے شہر (یعنی دہلی میں) ایک وردی عام ہے۔ ملا، حافظ، بساطی، پنجہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، جولاہا، منہ پر داڑھی اور سر پر لامبے بال، لیکن میں نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن اپنا سر منڈوایا۔" اسی طرح غالبؔ، عام لوگوں سے جدا لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی پہنتے تھے اور ہزاروں کے مجمع میں فوراً شناخت کیے جاتے تھے۔ ۱۲۷۷ ہجری میں جب دہلی میں شدید وبا (ہیضہ) پھیلی اور ہزاروں لوگ مر گئے، تو اس کا حال اپنے شاگرد میر مہدی مجروحؔ کے خط میں لکھتے ہیں:" میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لئے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔" یعنی غالبؔ، عوام کے ساتھ مرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اردو ادب کے چار عظیم شعرا میں میر تقیؔ، میر انیسؔ اور علامہ اقبالؔ نے اپنے اپنے دور میں کسی نہ کسی کو اپنا استاد بنایا اور اپنے ابتدائی دور میں ان سے فیض حاصل کیا، لیکن مرزا غالبؔ وہ تنہا عظیم شاعر ہیں، جنھوں نے کبھی شاگرد کی حیثیت سے کسی کے سامنے اپنا زانو خم نہیں کیا۔ علمائے ادب اور محققین نے اشارات کیے ہیں کہ مرزا غالبؔ بعض اوقات علم عروض و قواعد و نحو میں مصطفیٰ خان شیفتہ سے مشاورت کرتے تھے، لیکن بہر حال کسی کے کبھی بھی شاگرد نہ رہے۔

یہ بھی عجیب ہے کہ غالبؔ نے اپنے کو ہمیشہ فارسی کا شاعر جانا، لیکن آج سارے جہان میں غالبؔ کی پہچان، آن بان سب اردو شاعری اور نثر سے باقی ہے۔ غالبؔ اپنی فارسی شاعری پر فخر کرتے اور اسی کی وجہ سے زندہ و جاوید رہنے کی امید رکھتے تھے:

غالبؔ اگر این فن سخن، دیں بودے
آں دیں را کتابِ ایزدی، ایں بودے

یعنی اگر شاعری دین ہوتا تو میرا دیوان اس کی آسمانی کتاب ہوتا۔ کہیں کہتے ہیں۔

کوکبم را در عدم، اوجِ قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

یعنی میرا ستارہ میرے مرنے کے بعد چمکے گا اور میری شاعری کی شہرت دنیا میں میرے بعد ہوگی۔ غالبؔ نے پہلے عبدالقادر بیدلؔ کے رنگ تخیل میں شعر کہنا شروع کیا:

اسدؔ ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہارِ ایجادی بیدلؔ پسند آیا

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

پچیس سال کی عمر تک غالبؔ پر بیدلؔ کی نازک خیالی اور مشکل پسندی سوار رہی ہے اور غالبؔ اس امتحان میں کوئی خاص امتیاز پیدا نہ کر سکے، چنانچہ بعض دوستوں جن میں مفتی صدرالدین قابل ذکر ہیں ان کی نصیحتوں پر عمل کر کے اپنے رنگ کو بدلا اور پھر فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، بیان اور مضمون آفرینی کی جولانیاں دکھانے لگے اور زمانے میں ابھرنے لگے، لیکن ابھی بھی ان کی زبان پر نعرہ وہی تھا:

فارسی بین تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

یعنی اگر نقش رنگی دیکھنا ہے تو فارسی کلام دیکھو، کیوں کہ اردو کا میرا مجموعہ بے رنگ ہے۔
ناظم ہروی نے ایک نظم میں مشاہیر شعراے فارسی کی نام بنام مدح کی ہے اور انھیں استادِ فن ٹھہرایا:

ز خسروؔ چوں بہ جامیؔ رسید
ز جامیؔ سخن را تمامی رسید

غالبؔ نے فارسی سخن تمام کو غلط قرار دیتے ہوئے فرمایا:

ز جامیؔ بہ عرفیؔ و طالبؔ رسید
ز عرفیؔ و طالبؔ بہ غالبؔ رسید

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جہاں بھی مقطع میں غالبؔ نے اپنے نام کو استعمال کیا ہے، وہ شعر قدرتی طور پر بلند، مشہور اور معروف ہوا۔ چند مقطعے ملاحظہ کیجئے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

یہ مسائلِ تصوف ، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

آتے ہیں غیب سے ، یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

پانی سے، سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینہ سے ، کہ مردم گزیدہ ہوں

غالبؔ ! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوترابؑ میں

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو ، جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے ، سحر ہونے تک

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت ، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو ، غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت ، غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

حقیقت یہ ہے کہ بغیر لطیفے کے، بیان غالبؔ ناتمام ہے۔ایک دن مرزا صاحب کے ایک رشید شاگرد نے کہا کہ حضرت! میں آج امیر خسروؔ کی قبر پر گیا تھا۔مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔اس کی کھرنیاں دل کھول کر کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔دیکھیے تو، میں کتنا فصیح ہو گیا ہوں۔مرزا نے کہا: ارے میاں! تین کوس کیوں گئے، میرے پچھواڑے میں جو پیپل کا درخت ہے، اگر اس کی پیپلیاں کھا لیتے تو تمھارے چودہ طبق روشن ہو جاتے۔

آخر میں غالبؔ ہی سے مدد لیتے ہوئے ہم بھی یہی کہتے ہیں :

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

☆......☆......☆

نیویارک لائبریری میں دیوانِ غالبؔ کا نایاب نسخہ

جولائی ۱۹۹۸ء میں راقم نے دیوان غالبؔ کے نایاب نسخہ کو نیویارک سنٹرل لائبریری میں دریافت کیا جو ۱۸۶۳ء میں آگرہ کے مطبع مفید خلائق سے شائع کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ نمبر ۹۱۲۰ ۱۵۷ اس لائبریری میں ایک مقوّی کے ڈبے میں ۱۹۳۲ء سے محفوظ ہے اور اس ۲۶ سال کے عرصے میں کسی شخص نے اسے نہیں کھولا، کیوں کہ یہ کاٹیلاگ کی غلطی سے ہندوستانی ادب کے زمرے میں شامل نہ تھا۔ اس دیوان کے پہلے صفحہ پر پنسل کی پھیکی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۶۳ء میں آگرہ میں خرید اگیا۔ اندرونی صفحہ پر مسٹر ٹراوس نے دستخط کر کے ۴ دسمبر ۱۹۳۰ء تاریخ لکھی ہے۔

نیویارک لائبریری نے اس پر ۱۹۳۲ء کی مہر لگا کر محفوظ کیا تھا۔ ''دیوان غالبؔ'' کا یہ نسخہ اچھی حالت میں محفوظ ہے۔ یہ بڑی جلد کی کتاب کی صورت میں ۱۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر پندرہ سطریں لکھی گئیں ہیں۔ اس دیوان میں کل ۱۷۹۵ اشعار ہیں۔ دیوان آیت ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے شروع ہو کر اس بیت پر تمام ہوتا ہے۔

نگویم تا نباشد نغز غالبؔ
چہ غم گر ہست اشعار من اندک

(ترجمہ: غالبؔ عمدہ اور عالی اشعار کے سوا نہیں کہتا۔ اسے غم نہیں اگر اشعار بہت کم ہیں)

غالبؔ کا اُردو دیوان ان کی زندگی میں یعنی **1869**ء تک پانچ مرتبہ شائع ہوا۔ غالبؔ کا دیوان پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں دہلی میں سرسید احمد خان کے بھائی سید محمد خان کے چھاپہ خانے میں مطبع سید الاخبار کے لیتھوگرافک پریس سے چھپا تھا۔ اس دیوان میں ۱۰۸ صفحات اور ہر صفحہ پر پندرہ سطریں ہیں اور اس میں کل ۱۰۹۵ اشعار ہیں۔ اُردو کا دوسرا ایڈیشن مئی ۱۸۴۷ء میں منشی نورالدین احمد لکھنوی کے مطبع دارالسلام، حوض قاضی، دہلی سے چھپا۔ اس میں اشعار کی تعداد ۱۱۵۹ ہے۔ اس کا تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی، دہلی سے جولائی ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا جس میں ۸۸ صفحات اور ۱۷۹۶ اشعار ہیں۔ یہ ایڈیشن محمد حسین خان تحسین کی زیرِ نگرانی شائع ہوا۔ دیوان چوتھی بار ۱۸۶۲ء میں محمد عبدالرحمٰن خان کی زیرِ نگرانی مطبع نظامی، کانپور سے شائع ہوا۔ اس میں ۱۰۴ صفحات اور ۱۷۹۶ اشعار ہیں۔ ۱۸۶۰ء میں آگرہ کے مطبع مفید خلائق کے مالک منشی شیونرائین نے غالبؔ کو خط لکھا

کہ آپ گھر کا مطبع چھوڑ کر باہر کیوں چھپوا رہے ہیں۔ چنانچہ غالبؔ نے انھیں دیوان شائع کرنے کی اجازت دی اور ۱۸۶۳ء میں یہ دیوان شائع ہوا جو نیویارک کی لائبریری میں موجود ہے۔ منشی صاحب دیوان میں غالبؔ کی تصویر چھاپنا چاہتے تھے، چنانچہ غالبؔ نے اپنی قلمی تصویر ان کی نذر کی تھی لیکن یہ تصویر دیوان میں نہیں چھپی۔ یہ دیوان غالبؔ کی زندگی کا آخری ایڈیشن ہے۔ اس دیوان کے آغاز میں غالبؔ نے ۲۲ سطروں میں فارسی میں مقدمہ لکھا، جس میں تاکید کرتے ہیں کہ اگر سخن سرایان کچھ پراگندہ اشعار، جو اس دیوان میں نہیں، دریافت کریں تو اسے دیوان کا جزو نہ بنائیں۔ غالبؔ کہتے ہیں:

''امید کہ سخن سرایان سخنور ستای پراگندہ ابیاتی را کہ خارج ازیں اوراق یابند از آثار رگ کلک این نامہ سیاہ نشاسند۔''

لیکن افسوس کہ دیوان مرتب کرنے والوں نے اس پر عمل نہ کیا اور اب جدید اڈیشنوں میں ۱۵۹۰ اشعار ایسے ملتے ہیں، جو اصلی دیوان میں شامل نہیں۔ یہ بھی زمانے کی ستم ظریفی ہے۔ ان اشعار کو باقیات کا جزو ہونا چاہیے تھا۔ غالبؔ نے اپنے مقدمہ کو اس طرح ختم کیا ہے۔ ''نقاش کے بہ اسداللہ خان موسوم بہ میرزا نوشہ معروف و بہ غالبؔ متخلص ست۔ چناں چہ کہ اکبرآبادی مولد و دہلوی مسکن ست۔ فرجام کار نجفی مدفن نزباد۔''

(ترجمہ: ''یہ نقاش اسداللہ خان کے نام سے موسوم، مرزا نوشہ کے نام سے معروف اور غالبؔ تخلص کرتا ہے، چنانچہ یہ متولدِ اکبرآباد اور مقیمِ دہلی ہے اور نجفِ اشرف میں دفن اس کا خاتمہ کار ہوگا)۔''

مرزا غالبؔ کی خواہش تھی کہ انھیں نجفِ اشرف میں دفن کیا جائے۔ عرفیؔ شیرازی کی طرح انھوں نے اپنے فارسی قصیدے میں لکھا:

چو عرفیؔ سرو برگ نازم کجا
با دعویٔ زبان درازم کجا
من ایں کار برخود گرفتم بہ چشم
بہ مژگان گر او رفت، رفتم بہ چشم

یعنی عرفیؔ شیرازی کی طرح میں ناز نہیں کرسکتا اور اس کی طرح زبان دانی کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا۔ میں نے نجف جانے کے لئے آنکھوں سے کام لیا ہے۔ عرفیؔ پلکوں کے بل گیا تھا، میں آنکھوں کے بل جاؤں گا۔

یہاں غالبؔ، عرفیؔ کی غزل کے مشہور شعر کی طرف اشارہ کرر ہے ہیں:

بہ کاوش مژہ از گور تا نجف بروم　　　　اگر بہ ہند بہ خاکم کنند اگر بہ تتار

اس دیوان کے آخر میں نواب ضیاءالدین احمد خان نیّرؔ درخشاںؔ کی تقریظ ہے جو غالبؔ کی بیوی کے چچازاد بھائی تھے۔ وہ غالبؔ کو اپنا استاد مانتے تھے اور اُردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف مطبع نظامی کے ایڈیشن کو چھوڑ کر ان دیوانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جسے ہم کتابت اور ظاہری شکل وصورت سے تسلی بخش کہہ سکیں، چنانچہ ہمیشہ غالبؔ نے اس حسرت کا اظہار کیا کہ ''کاش کہ میرا دیوان ایک مرتبہ توحسن واہتمام سے چھپ جاتا۔''

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

اگر چہ بیسویں صدی میں ''دیوانِ غالبؔ'' کے متعدد عمدہ، دیدہ زیب اور قیمتی ایڈیشن شائع ہوئے لیکن اس میں اشعار کا اضافہ کیا گیا، جس کے لئے غالبؔ نے منع کیا تھا۔

☆......☆......☆

غالب کی حمد

یہ سچ ہے کہ برصغیر میں حمد یہ ادب پر بہت کم تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا۔ جب کہ برصغیر کے فارسی اور اُردو شعری کلام میں حمدوں کی کمی نہیں تھی۔ شاعری کو دین اور دنیا کے خانوں میں تقسیم کر کے دینوی شاعری کو شعرستان سے جلاوطن کرنے کی سازش ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئی اگر چہ اس سازش میں دانستہ اور نادانستہ وہ شعرا اور تنقید نگار بھی شامل رہے جنھوں نے خود دینی شاعری کی نشو نما کی تھی۔ اگر انصاف اور تعصب کے بغیر عالمی ادب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر بڑی زبان کا شعری شاہکار کا مآخذ دینی یا عقیدتی سرچشمہ ہے تو پھر فارسی اور اُردو ادب کے ساتھ یہ برتاؤ کیوں روا رکھا گیا۔ اُردو مرثیہ جو ادب عالیہ کا عظیم سرمایہ ہے جس نے گلشن اُردو میں رنگ برنگی پھول کھلائے زبان و بیان کو خارجی اور داخلی واردات سے مالا مال کر دیا آج کسمپرسی کا شکار ہے۔ نعت اگر چہ گزشتہ چند دہائیوں سے ارتقا کی منازل پر گامزن نظر آرہی ہے لیکن اس کے لئے ابھی ادب عالیہ میں کوئی عالی مقام اِس لئے حاصل نہ ہوسکا کہ اس کو انیسؔ و دبیرؔ جیسے معمار نہ مل سکے بلکہ اس کے برخلاف مولویت کے خشک اور سخت پہرے اس کے موضوعات اور زبان پر بٹھا دیئے گئے اور شاعر کو ان پر سختی سے عمل کرنے کہ تنبیہ بھی کی گئی۔ رہا حمد کا مسئلہ وہ تو تصوف برائے شعر گفتن کی طرح صرف مجموعہ کلام کی پہلی سطروں پر بطور رسم تزئین کے ہو کر رہ گیا۔ اِسے اُردو ادب کی خوش بختی کہیے کہ اِدھر دس بارہ سال سے حمدوں کے مجموعہ اور حمدوں پر ادبی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں اور مقالات منظر عام پر نظر آرہے ہیں۔ شاعری جذبات کی نمائش گری ہے محاکات کی روشنی اور خیالات کی بارش جب ذہن کے لق و دق صحرا پر آندھی بن کر ٹوٹتی ہے اور سیلاب کی تیز روانی کے مانند اشعار دل و دماغ سے بہنے لگتے ہیں تو اس میں سچائی اور صداقت کا زور ہوتا ہے اور اسی کو فطری اپج یا آمد کہتے ہیں جو اکتسابی شاعری سے بالکل مختلف ہوتی ہے چنانچہ دینی شاعری جس کا مبدا ماوا اور ملجا حمد ہے شاعری کی دوسری صنفوں اور قسموں سے اس لئے بھی جدا اور ممتاز ہے کہ اس میں بے تکلفی اور بے ساختگی ہے۔ یہاں حمد نگار عجز و انکساری کا پیکر ہے۔ وہ اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں کُھلے دل سے اپنے دلی جذبات کو پیش کرتا ہے۔ اُس کے قلم سے نکلا ہوا ہر ہر حرف اس کے دل کی ترجمانی کرتا ہے یہاں عبد اور معبود کے درمیان حائل پردے ہٹ جاتے ہیں اور راز و نیاز کی منزلوں میں بندہ تکلفات سے برطرف ہو جاتا ہے اور معرفت الٰہی کے بیکراں دریا میں غوطہ زن ہو کر عبادت عظمیٰ میں محو ہو جاتا ہے۔ اس شاعری میں اُسے داد و تحسین کی فکر نہیں

رہتی بلکہ بخشش وفنا کی آرزو جس پر وہ مطمئن اور مسرور نظر آتا ہے۔ اِسی لئے حمد، مناجات اور دعا کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا شاعر کے طرز بیان اور جذبوں کے اظہار سے اشعار مختلف شکلیں اختیار کر کے زبان وبیان کی محدودیت کا اعلان کرتے ہیں چنانچہ شاعر اگر دریا سے آب رحمت کو پوری طرح سینچ نہ سکے تو پھر بھی اپنی استطاعت کے مطابق اپنے ساغر قرطاس میں اتنا کھینچ لینے کی کوشش کرتا ہے کہ اُس کی تشنگی کسی حد تک کم ہو جائے۔ اِسی لئے برگزیدہ ہستیوں کی حمدیں جو ہمارے درمیان دعاؤں کی صورت میں موجود ہیں ان کی عالی ظرفی، وسیع قلبی اور معرفت کی بلندی کا پتہ دیتی ہیں۔ اگر چہ دعا، حمد اور مناجات کا گلدستہ ہے جس میں دعا کرنے والے کا مشاہدہ آفاق اور عرفان نفس شامل ہے اور اسی معرفت نفس و آفاق کی تاکید بھی آیات اور احادیث میں نظر آتی ہے۔

روایت ہے کہ حضرت آدمؑ نے جو پہلا کلمہ اپنی زبان سے ادا کیا وہ ''الحمد اللہ'' تھا اور اسی کلمہ کی نسبت سے قرآنی سورہ فاتحہ کو سورہ حمد بھی کہتے ہیں۔ حمد دراصل اسمائے باری تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس وتوصیف ہے چونکہ اسمائے خداوندی میں صرف اللہ اسم ذات ہے اور باقی تمام نام اسم صفات ہیں اور تمام تعریف وثنا اسم ذات میں نمایاں ہے۔ اِس لئے اسمِ اللہ سب سے مکمل اور سب سے عالی حمد ہے جس طرح محمدؐ الرسول اللہ سب سے مکمل اور سب سے عالی نعت ہے۔ اگر چہ اسم ذات کی توصیف ممکن نہیں اِس لئے حمد نگار اس کے باطنی جوہر جس کا اساس شکر اور تسلیم ہے اس کو اپنی عجز اور بندگی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ لفظ حمد پہلی بار حضرت آدمؑ نے زبان سے دہرا کر پہلی حمد کہی اور قرآنی آیات کے بموجب ہر زمان ومکان میں تمام مخلوق حمد وثنا میں مشغول رہے لیکن اگر حمد یہ تاریخ کا ادبی تحقیقی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دور رسالتمآبؐ میں حمد ونعت ومنقبت ایک ہی سلسلہ نظم کا حصّہ ہوتی تھیں جیسا کہ حضرت کعبؓ بن مالک اور حسانؓ بن ثابت کے اشعار سے ظاہر ہے۔

جناب رشید وارثی حمد کی تاریخ پر مبادیات حمد میں لکھتے ہیں۔ ''حضور اکرم کا زمانہ امت مسلمہ کے لئے تنازع للبقا اور معرفۂ حق وباطل اور اقامت دین کا دور تھا۔ لہٰذا وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو جہاد پیہم اور اجتہاد مسلسل کے لئے بروئے کار لانے پر مجبور تھے۔ (رہا نعت گوئی کا معاملہ تو یہ اس دور کی اہم ترین ضرورت تھی تاکہ منافقوں اور مرتدین کے فتنوں سے عامتہ المسلمین کی حفاظت کی جاسکے) اور چونکہ تقریباً تمام مذاہب کے پیروکار وجود باری تعالیٰ کے قائل تھے۔ لہٰذا حمد نگاری کی اس دور میں بھی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ البتہ خلافت راشدہ کے آخری دور میں جب رسول ﷺ کے خلیفۂ برحق امیر المومنین حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کے خلاف حضرت معاویہ بن سفیانؓ

نے علم بغاوت بلند کر کے شام میں ملوکیت کی بنیاد رکھی تو مسلمانوں کے اخلاقی رویہ پر اس کے بڑے منفی اثرات مرتب ہوئے اور وہ زر و مال کی ہوس میں جائز ناجائز اور حق و ناحق میں تفریق کو بھی فراموش کرنے لگے۔ اس اخلاقی زوال کے ساتھ بعض مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں بھی بگاڑ پیدا ہونے لگا۔ اس پُر آشوب صورتحال میں ایک خلیفہ راشد کی حیثیت سے باب مدینۂ علم و حکمت حضرت علیؓ ابن ابی طالبؑ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نے اقامت دین اور امر بالمعروف کی ذمہ داریاں انجام دیتے ہوئے جو فصیح و بلیغ خطبات دیئے اور جو پند و نصائح پر مبنی اشعار کہے ان میں حمد باری تعالیٰ، صفات باری تعالیٰ اور دعا و مناجات کے اعلیٰ ترین شواہد ملتے ہیں۔ یہ شواہد علم الٰہیات کے نقش اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''المرتضیٰ'' میں بقول سید ابوالحسن علی ندوی رحمتہ اللہ علیہ کہ '' حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ الکریم کی بلاغت نہ صرف اپنے زمانہ کی حد تک بلکہ ادب و بلاغت کے بین الاقوامی ریکارڈ اور تاریخ ادب کے مختلف ادوار کے لحاظ سے بھی ایک جداگانہ شان رکھتی ہے۔''

جہاں تک تنقیدی تقاضوں کا تعلق ہے حمد کے مضمون اور قلبی واردات پر گفتگو انفرادی اور **subjective** حیثیت رکھتی ہے اس پر پابندیاں حمد کے ارتقا میں مزاحمت کا باعث ہو سکتی ہیں۔ نعت کے بیان میں بھی پابندیاں مشکلات کا باعث اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیش کر رہی ہیں۔ فنی مسائل کا جائزہ جائز ہے اور بہر حال حمد نعت اور منقبت چونکہ شاعری ہے اس لئے شاعری کے فنی اصولوں سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتیں۔

ان نکات کی روشنی میں جب ہم غالبؔ کی حمدوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے کہ اُردو و فارسی کے اس عظیم شاعر کی حمدوں کے بارے میں کوئی خاطر خواہ تحقیقی و تنقیدی کام تو ایک طرف اس عمدہ کلام سے عوام نہیں بلکہ خواص بھی نا آشنا ہیں۔ چونکہ مضمون کی طوالت ہمیں اجازت نہیں دیتی اس لئے غالبؔ کی دو فارسی حمدوں میں ہم ایک پر تفصیلی اور دوسری پر اجمالی گفتگو کریں گے۔

غالبؔ کے فارسی اور اُردو کلام میں حمدیہ مفرد اشعار کی کمی نہیں جو زیادہ تر شوخ اور طنزیہ ہیں اور صنعت ایہام و ابداع سے ان کے ظاہری معنی اور باطنی تصوّفی معانی میں فرق ہے لیکن سب میں کمال ربوبیت اور تحقیر بندگی نمایاں ہے۔ اس مضمون میں ہم نے ان اشعار پر گفتگو اس لئے بھی نہیں کہ کہ دیوان غالبؔ پر لکھی گئی تیس (30) سے زیادہ شرحیں معرفت کے مضامین پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔ ہم جن دو فارسی حمدوں کا ذکر کر رہے ہیں اُن میں ایک حمد جو دیوان فارسی میں قصیدہ اوّل حمد باری عزاسمہ کے عنوان پر نظر آتی ہے۔ اس حمد میں باون (52) اشعار ہیں۔ اس کا مطلع ہے :

یا خموشی ساخت پندارم بامید قبول
گفته خود حرفی و خود را در گماں انداخته

غالبؔ نے اس حمد میں اپنے خاص طرز میں پہلے مشاہدہ آفاق کی گفتگو کی ہے اور تخلیق عالم کا خوبصورت تذکرہ کیا ہے تخلیق اشرف المخلوقات اور اس کے لئے عالم ایجاد میں یہ بزم آرائیاں باعث امتنان وشکر قرار دے کر اپنے بے مائیگی اور انکساری کا اقرار کیا ہے۔ غالبؔ اپنی معجز بیانی اور معنی آفرینی کو خدا کی دین بتا کر کہتے ہیں۔

دجلہ در ساغر معنی طرازان ریختہ
رشحہ در کاسۂ دریا و کاں اندایختہ

غالبؔ کو جو آتش بیانی عطا ہوئی اُس نے اپنے قلم سے دنیا کو آتش زار بنا دیا۔ غالبؔ کی ہڈیوں کے اندر جو تو نے بانسری کی طرح کھوکھلی نالی رکھی اُس نے اس کی نغمگی سے توحید کے نغمہ کا شور برپا کیا۔ غالبؔ جو ایک بے بس ترک ہے اُس نے اپنی حمد میں خود کو فنا فی اللہ کر دیا۔ یہ وہ بلبل بے بضاعت ہے کہ جس نے شاخ طوبیٰ پر اپنا آشیاں بنالیا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہیں کہ علامہ اقبالؔ نے انہیں مضامین کو دوسرے لفظوں میں اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔

سوخت عالم را صریر کلک من غالبؔ منم
کاتش از بانگ نی اند ر نسیاں انداختہ
می سرایم نغمۂ توحید و شور ایں نوا
چوں نیم سوراخھا در استخواں انداختہ
زانکہ ایں ترک تباہ اندیشہ در عنوان حمد
حرفی از فقر و فنا اندر میان انداختہ
ایں گرانجاں عندلیب بے نوا کاندر خیال
شاخ طوبیٰ را ز بار آشیاں انداختہ

غالبؔ کی دوسری فارسی حمد جو (114) اشعار پر مشتمل ہے ان کی معرف مثنوی ''ابر گہر بار'' کے آغاز میں نظر آتی ہے۔ اس حمد کا حُسن یہ ہے اس میں مشاہدہ حق کی گفتگو بغیر بادہ وساغر کے مکمل کی گئی ہے۔ حمد میں مشاہدہ عالم اور مشاہدہ آدمؑ کا تجربہ اور تجزیہ ہے۔ مثنوی ابر گہر بار کا سرنامہ سخن یہ حمد اس مطلع سے طلوع ہوتی ہے۔

سپاسی کز و نامہ نامی شود
سخن در گذارش گرامی شود

یعنی وہ حمد کہ جس سے تحریر کی آبرو بڑھ جاتی ہے اور بات بیان میں وقعت پاتی ہے۔اس مطلع کے بعد مسلسل آٹھ اشعار میں غالبؔ ہر شعر کے آغاز میں ''سپاسے'' یعنی وہ حمد کہہ کر یوں مضمون باندھتے ہیں۔

وہ حمد کہ جس سے بیان کی ابتدا ہوتی ہے،
جس سے کلام یوں ''نمودار'' ہو جاتا ہے جیسے رخسار سے خط۔
وہ حمد کہ جیسے ہی لبوں پر آئی،
رُوح کو اس نغمے سے راحت ملی۔
وہ حمد جو صاحبِ عقل اور ذی شعور انسان
خود کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھنے کے لئے کرتا ہے۔
وہ حمد جسے غیب کے فرشتے
اپنی دُعا اور حمد میں بار بار دہراتے ہیں۔
وہ حمد کہ جسے سنتے ہی عشقِ الٰہی کے دیوانے،
قلم کی آواز پر دل دے دیتے ہیں۔
وہ حمد کہ جس کے ساتھ استغفار ہو،
جو دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔
وہ حمد کہ جو دل کے جوش کی شدّت سے،
فکر سے غفلت کو دُور کر دے۔
وہ حمد کہ جس سے ''وحدت'' کا جلوہ نظر آئے اور دُوئی مٹ جائے،
دل کو روشن کرنے والی اور بصیرت بڑھانے والی حمد۔

پھر فوراً گریز کر کے کہتے ہیں۔ہاں! حمد صرف اُسی خدا کی شایانِ شان ہے جو نفس کی تربیت کر کے حق بینی عطا کرتا ہے۔یہ غالبؔ کی جدّت ہے کہ مثنوی میں بطور تشبیب یا چہرہ (نو) اشعار لکھ کر گریز کیا اور پھر اسی مضمون کو

اسمائے صفاتی اور اسم ذات سے جوڑ کر دس بارہ شعر نام گرامی اللہ کا اثر اور تاثیر سے سجائے۔

متاع اثر بسکہ ارزاں دہد

مسیحا بداں مردہ را جاں دہد

چونکہ اسی نام کا اثر بہت ہے اسی اسم سے حضرت عیسیٰؑ مردے کو زندہ کر دیتے ہیں۔

بود نام پاکش ز بس دل نشیں

تراشند پاکانش از دل نگیں

چونکہ اس کا پاکیزہ نام دل میں جگہ کرنے والا ہے اس لئے پاکیزہ لوگ اس نام کے لئے اپنے دل کو نگینہ بناتے ہیں۔

بنامی کہ گم گشتہ بُردن درو

ز پرّے نہ گنجد شمردن درو

اس کے ایسے نام کے ساتھ کہ جس کو لینا ممکن نہ ہو اور جس کے تعدّد کی گنجائش نہ ہو۔

یہاں اس شعر میں غالبؔ نے دریا کو کوزے میں بند کیا یعنی خدا احد ہے اور یہ واحد عددی نہیں اس مطلب کو امجدؔ حیدرآبادی نے اپنی رباعی میں یوں نظم کیا جو وحدت الوجود کا مضمون ہے۔

ذرّے ذرّے میں ہے خدائی دیکھو — ہر بت میں شان کبریائی دیکھو

اعداد تمام مختلف ہیں باہم — ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو

پھر غالبؔ قرآنی آیات کی ترجمانی کرتے ہوئے مشاہدہ عالم کی دعوت دیتے ہیں جس کی تاکید کی گئی ہے۔

ببیندیش کایں چرخ و پرویں کراست

چنیں پردۂ ساز رنگیں کراست

تو سوچو یہ آسمان اور ستارے کس کے ہیں۔ اور ساز کا ایسا رنگین پردہ کس نے بنایا ہے۔

ببیندیش کایں روزگار از کجاست

نمود طلسم بہار از کجاست

ذرا سوچو کہ یہ بدلتا ہوا زمانہ کہاں سے آیا اور بہار کا یہ جادو کدھر سے رنگ لایا۔

غالبؔ نے پھر عقل کی داستان چھیڑی عقل کی اہمیت دکھا کر اس کو بھی اصل کی خبر سے بے خبر بتایا اور وجدان اور احساس اور جذبہ کو عقل کا امام بتایا۔

خرد کز جہانیست پیشش خبر

نباشد ز عنواں خویشش خبر

یہی عقل جس کو خبروں کا ایک جہاں حاصل ہے اس کو اپنی اصل کی خبر نہیں۔

آگے چل کر کہتے ہیں۔ عقل جو اس کا عرفان چاہتی ہے تو اس عرفان کے ظہور سے عقل کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

ان مطالب کے بعد خدا کی رحمت اور محبت جو مومن اور کافر پر اس دنیا میں یکساں ہے اور سب اس کی پناہ میں ہیں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اُس کی رحمت کے دروازے کھلے ہیں۔

مناجاتیاں پیش وی در نماز

خراباتیاں را بد و چشم باز

نماز میں دعا مانگنے والے اس کے سامنے سر بسجدہ ہیں، اور جو میخانہ کے رسیا ہیں وہ بھی اس کی طرف آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔

اگر کافر انند ز نہاریش

وگر مومناں در پرستاریش

اگر کافر ہیں تب بھی اس کی پناہ چاہتے ہیں اور مومن ہیں تو اس کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں۔

پھر غالبؔ توحید پر ایک عظیم شعر کہتے ہیں۔

چوں ایں جملہ را گفتۂ عالم اوست

بہ گفت آنچہ ہرگز نیابید ہم اوست

یعنی جس طرح یہ سب کی سب جن کو تم نے عالم کہا اس کی ذات احد ہیں اُسی طرح وہ چیزیں جو ہیں اور بیان میں نہیں آسکتیں وہ بھی اس کی ذات میں ہیں۔

چوں ایں جا رسیدم ھمایوں سروش

بمن بانگ برزد کہ غالبؔ خموش

جب میں اس شعر پر پہنچا تو مبارک فرشتے نے مجھے پکارا کہ غالبؔ بس اب چپ ہو جاؤ۔

ب پاشید در لرزہ بندم ز بند

تپاں ھمچو بر روے آتش سپند

مجھے کپکپی چڑھ گئی اور جوڑ جوڑ ٹوٹنے لگا بدن ایسا تپا جیسے آگ پر رائی کے سیاہ دانے۔

یہ تھا غالبؔ کا اندازِ بیان اور حمد کا سفر جس میں تمام لوازمات بندگی اور تمام کمالات ربوبیات کو حتی المقدور اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا۔ اس کی برصغیر نہیں بلکہ دنیا کے عربی فارسی اور اُردو ادب میں مثال نہیں۔

☆......☆......☆

حمد

ای ز وهم غیر غوغا در جهان انداخته
گفته خود حرفی و خود را در گمان انداخته

دیده بیرون و درون از خویشتن پروانگهی
پردهٔ رسم پرستش درمیان انداخته

ای اساس عالم و اعیان به پیوند الف
همچنان بر صورت علم و عیان انداخته

نقش بر خاتم ز حرف بی صدا انگیخته
شور در عالم ز حسن بے نشان انداخته

چرخ را در قالب ابداع در واریخته
خاک را بر نطع پیدائی ستان انداخته

عاشقان در موقف دار و رسن وا داشته
غازیان در معرض تیغ و سنان انداخته

رنگها در طبع ارباب قیاس آمیخته
نکته ها در خاطر اهل بیان انداخته

آنچنان شمعی براه شیروان افروخته
اینچنین گنجی بجیب بیدلان انداخته

با چنین هنگامه در وحدت نمی گنجد دوئی
مرده را از خویش دریا بر کران انداخته

رایغی کش پویهٔ دشت خیالت در دلست
وهم در شبگیر دستش بر عنان انداخته

کاتبی کش نشهٔ وصف جلالت در سر است
لرزه در تحریر کلکش از بنان انداخته

نردبانی بسته با دیوار کاخی در نظر
انتعاشی در نهاد این و آن انداخته

رفته هر کس تا قدم گاهی و زانجا خویش را
پایه پایه از فراز نردبان انداخته

ای به نزهتگاه تسلیم رسولؐ حق شناس
ز آتش نمرود طرح گلستان انداخته

دی بـه رستـاخیـز تـار و مـار قـوم ناسپاس
جـان اژدر در تـن چـوب شبـان اندختـه

هر کجا سرهنگ حکمت در سیاستگاه قهر
قـرعـۀ عـرض شـکـوه قـهـرمـان انداختـه

در بـروت نـحـس اصغر چنگ سفاکی زده
در گـلـوی سـعـد اکبـر طیلسـان انداختـه

از تـو در هـنـگامه بازی خورد گان تار و پود
رقـعـه رقـعـه از پلاس و پرنیـان انداختـه

وز تـو در بـازار سـودا پیشـگان هست و بود
بـے متـاع آوازۀ سـود و زیـان انـداختـه

داده در تـوحیـدم آئیـن غـزل گـفتن بیاد
ای هـم از گـفتـار بـندم بـر زبـان انداختـه

بـر رخ چـون مـاه بـرقـع از کتـان انداختـه
در نهـفتـن پـرده از راز نهـان انـداختـه

گشته با چشم بتانش نقش هطرحی درست
هـر کـرا دردت ببستـر نـاتوان انداختـه

شحنۀ عشقت کرا بنشانده بر نطع قصاص
بـر کـنـار نطـع فـرش ارغـوان انداختـه

تـا بـود عـاشـق بـزنـدان عدم دایم اسیـر
در نهـادش شـور سـودای دهـان انداختـه

تـا بـود شـاهـد بـه آزار دل عـاشق حریص
در دلـــش ذوق سـمـاع الامـان انـداخـتـه

غم چو گیرد سخت نتوان شکوه از دلدار کرد
بهـر آسـانـی اسـاس آسـمـان انداختـه

گـل چـو مـاند دیر گردد بر دلش بازار سرد
بهـر تـجـدیـد طـرب طـرح خزان انداختـه

گلخن افروزان داغت هشت گلشن را چو خص
در گـزار نـالـۀ آتـش فشـان انـداخـتـه